

پار بھی اُترنا تھا

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام

کنیز نبوی



ناولٹ

چاندنی میں چمکتے ہوئے کلباڑی کے چھل کو دیکھا اور ختمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

شدید پیاس کا احساس کہیں کھو گیا تھا۔ اس کا دل اس کے کانوں میں پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی حواس کی رفتار اس کے بڑھتے ہوئے قدموں سے کہیں زیادہ تھی اور حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔

گاؤں کے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کہاں جاسکتی ہے۔

وہ تیزی سے کماؤ کے کھیت کی طرف بڑھا۔ اچانک اس کی سماعت سے کوئی سرگوشی ٹکرائی۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ رات کے ہولناک سنائے میں اپنی ہی سانسوں کی آواز کسی ڈھول سے کم نہیں لگ رہی

پیاس کے شدید ترین احساس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا حلق خشک ہو گیا ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”نجمہ! پانی پلاؤ۔“ اس نے اپنی محبوب بیوی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے گردن موڑ کر اپنے بائیں طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ خالی رہی سے ٹکرا کر واپس آیا تھا۔ ایک کرنٹ سا اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے آنکھیں میچ کر سر کو زور سے دائیں بائیں جھٹکا کر رہی سہی غنودگی کو بھگایا اور پوری آنکھیں کھول دیں۔ اپنی بے یقین کیفیت کو ختم کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے رلی کو چارپائی کے نیچے پھینک دیا۔

اور اب خالی بستر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

شک کا ناگ پھن پھیلانے اس کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چارپائی سے اتر اور جھک کر اس کے نیچے سے کلباڑی اٹھالی۔

اسی وقت شک کے ناگ نے اپنا زہر اس کے جسم میں اندر لے دیا۔ کلباڑی پر اس کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔ اک نگاہ صحن کے چاروں طرف ڈالی۔ اس کی چارپائی کے ساتھ بچوں کی چارپائی پر اس کے دونوں بچے آنے والے طوفان سے بے خبر نیند کی وادی کی سیر کر رہے تھے۔ اس کے قدم تیزی سے گھر کی دہلیز کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ نیم کی چھاؤں میں رکھی ہوئی گھڑوچی سے ایک گھڑا غائب تھا۔ اک خیال کوندا۔

”کیا وہ پانی بھرنے گئی ہے؟“ مگر دوسرے ہی پل اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

”نہیں رات کے اندھیرے میں اسے کیا ضرورت تھی جانے کی۔“ ایسی عورت کی سزا سوچتے ہوئے اس نے

تھی۔ سانس روکے آہستہ روی سے چلتے ہوئے دائیں جانب موڑ مڑنے سے پہلے اس نے جھک کر جائزہ لیا۔ دائیں طرف جہاں گئے کا یہ کھیت ختم ہو رہا تھا۔ وہیں نیم کا بوڑھا بیڑ تھا۔ جہاں دن کو چائلائی دھوپ میں باری بیٹھ کر بھٹکن اتارتے تھے۔ بڑھتی ہوئی کماؤ کی فصل کے سرے پر نیم کی جھکی ہوئی گھنی شاخیں۔ منہ رکھ کر راز و نیاز کرتیں۔

اور آج وہی نیم کا بوڑھا بیڑ وہ وجودوں کو پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس کی نظروں ہی دو سایوں پر پڑی۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ خون کی گردش تیز تر ہوئی اور پسینے کی بوندیں پیشانی پر نمودار ہو گئیں۔ وہ موڑ کاٹ کر تیزی سے آگے بڑھا، چانک کوئی کتا اس پر بھونکا۔ کتے کی آواز پر سائے چوکنہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔

”خبردار، بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“ اس کی دھاڑ پر چاند نے گھبرا کر بادل کے آوارہ ٹکڑے کا کونا کھینچ کر اپنے منہ پر رکھا۔ جیسے کوئی بچہ ڈر کر ماں کے پلوں میں منہ چھپاتا ہے۔

چاندنی کچھ ماند ضرور پڑی تھی۔ مگر اس کے قدم تیزی سے اٹھے تھے۔ تب ہی وہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔

اک سایا نیم کے پیڑ سے پشت لگائے سرک رہا تھا۔ وہ اسے نظروں ہی نظروں میں تاڑے کھڑا تھا۔ جوں ہی سایا سرک کر پیڑ کی دوسری جانب پہنچا، وہ چھلانگ لگا کے ایک ہی جست میں سائے کے سامنے آیا۔ اسی

وقت بادل نے جھٹک کر چاند سے اپنا پلو چھڑایا۔ چاند کی روشنی کچھ اور تیز ہو گئی۔ اس روشنی میں اس نے تھر آلود نگاہ اس سائے پر ڈالی۔ سائے کھڑا وجود اس کی بیوی کا تھا۔

”سارہ کے ابا! اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو۔“ اس کی سماعت سے خوف زدہ آواز ٹکرائی تھی۔ اس کے ہاتھ کلماڑی پر کچھ اور مضبوط ہو گئے۔

”کیا میں بے غیرت ہوں جو تجھے چھوڑ دوں۔“ اس کی آواز میں پہاڑوں کی سی سختی تھی۔ سائے کے ہاتھ معافی کے انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھے۔ نیچے آئے تو جڑے ہوئے ہاتھ۔ نیچے گئے۔ کلماڑی کے پہلے وار پر جو چیخ بلند ہوئی، دوسرے وار یہ فنا ہو گئی۔ اک اور وار نے اس کے تڑپتے وجود ٹھنڈا کر دیا۔

دوڑتے قدموں کی چاپ اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ پھر ایک دم اسے لگا۔ اس کی کلماڑی کی پیاس پانی اور بڑھ گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف غیرت کے شعلے تھے۔ جن کے نیچے وہ جل رہا تھا۔ یہ شعلے صرف کاروکاری کے خون سے ہی بجھ سکتے تھے۔

اس نے کارے کا پیچھا کیا۔ غیرت نے اس کے قدموں میں بجلی سی بھر دی تھی۔ سائے نے دوڑتے دوڑتے سر کو پیچھے گھما کر غیرت کے پجاری کو دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ٹھوکر کھا کے گرا۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھنے کی کوشش کرنے ہی لگا تھا کہ موت اس کے سر پہ پہنچ گئی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر اپنی موت کو دیکھا۔ جو اس سے گلے ملنے والی تھی۔ اس کے سر پر پہلی ضرب ہی بھرپور پڑی تھی۔ خوفزدہ سائے پر موت کے سائے پھیل چکے تھے۔

غیرت کے پجاری اور کلماڑی کی پیاس کو سیرابی مل گئی۔ چاند نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر زمین پر اشرف المخلوقات کو دیکھا اور خوف سے جھجھکری لے کر کالے بادل کی اوٹ میں چھپ گیا۔



دو ہرے قتل کی تفتیش کرتے کرتے دن کا ایک دن

گیا۔ صبح صبح جب وہ ڈیوٹی پر پہنچا تو تھانے میں پہلے سے دو آدمیوں کو بیٹھے دیکھا۔ جو پرچا کٹوانے آئے تھے۔ اس نے ان دو آدمیوں سے ساری تفصیل لے کر اے ایس آئی آچر خان کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ اور خود دو گھنٹے بعد ایسوی لینس لے کر جائے واردات پر

پہنچا تو حالات بہت خراب تھے۔ مقتول کے وارث بدلہ لینے کے لیے تیار تھے اور قاتل کے وارثوں نے بھی ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

اس نے آچر خان کو جلدی بھیجنے کے فیصلے پر اپنی دانش مندی کو داد دی۔ جس نے دونوں فریقوں کو سمجھا بچا کر ٹھنڈا کیا۔ بالآخر دو گھنٹے کے بحث کے بعد دونوں لاشیں ایسوی لینس میں رکھوا کر انہیں متعلقہ ضلع کے قریبی اسپتال پہنچا کر ایس ایچ او کریم بخش خود تھانے آ گیا۔

سپاہی کو بلا کر کھانا لانے کے لیے کہا اور سارے حالات و واقعات پر نئے سرے سے غور کرنے لگا۔

ٹھیک تین بجے سپاہی نے اسے بتایا۔ ”سائیں! اب ہر ایک آدمی آیا ہے۔ جو کچھ بھی نہیں بتاتا۔ کتا ہے کہ بڑے صوبیدار سے ملنا ہے۔“

”اندر لے آؤ۔“

”سلام سائیں۔“ اس نے اس گرد آلود پریشان وجود کو دیکھا اور کہا۔

”ہاں بول، کیا کام ہے؟“

”سائیں! میں مہرن ہوں اور میں نے دو خون کیے ہیں۔“



ان تین دنوں میں گزری تیس سالہ زندگی کا اک اک لمحہ میرے ذہن کی فلم اسکرین پر ریلو انڈز ہو رہا ہے۔ یادیں مجھے کچھو کی طرح ڈنک مار رہی ہیں۔ میں صرف سات سال کا تھا۔ جب میرا باپ ڈاکوؤں کے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ مغرب کا وقت تھا۔ بابا زمینوں سے واپس آیا ہی تھا کہ ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا۔ مورچہ بند دیہاتیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

پھر ڈاکو تو بھاگ گئے مگر غلام علی کی جان لے گئے۔ گاؤں والوں میں دونوں غلام علی کی بہادری کے چرچے رہے۔ پھر سب آہستہ آہستہ اس کی بہادری کے قصوں سمیت اس کی اولاد سے بھی غافل ہو گئے۔

چالیس ایکڑ زمین پر چچا کا قبضہ ہو گیا۔ جو ہمیں صرف آٹا دے کر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹتا کہ بھائی کے یتیم بچوں کو پال رہا ہے۔

اماں بھرپور جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چچا کی نظریں خراب ہوتی گئیں اور اماں کا خوف بڑھتا رہا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ جیسی کہ عام راتیں ہوتی ہیں۔ یہ تو مجھے بہت سالوں بعد بتا چلا کہ وہ رات میرے اندر بڑی آہستگی سے انقلاب لے آئی تھی۔

میں بڑی گہری نیند سو رہا تھا کہ جب اماں نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگایا۔ اماں کے آنسوؤں سے میرا پورا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ آنسوؤں نے میری نیند غائب کر دی تھی۔ سینے سے سراٹھا کر اماں کو دیکھا جس کا سارا جسم کانپ رہا تھا، وہ خوف سے ایک ہی جگہ ٹٹٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اماں جن سے ڈر گئی ہے۔ میں نے اماں کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ تو لینس کو مستحکم پایا۔

ہماری چارپائی کے پاؤں کی طرف واقعی ایک جن کھڑا تھا۔ جو میری ماں کو غصے سے گھور رہا تھا۔ اس کی شکل بالکل میرے چچا جیسی تھی۔ اماں کے آنسوؤں نے مجھے بہادر بنا دیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس جن کو گھور کر کہا۔

”میری اماں کو کیوں ڈر رہا ہے ہو۔“ اور وہ جن مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا۔ میں نے اماں کے چہرے کو اپنے ننھے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”دیکھو اماں! میں نے جن کو بھگایا ہے۔ اب تو نہ رو۔ وہ پھر آئے گا تو میں اسے پھر بھگا دوں گا۔“ اماں نے مجھے جوم کر بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ وہ ساری رات میں اماں کے ساتھ جاگتا رہا۔ فجر کی اذان کے بعد مجھے نیند آگئی۔ صبح اٹھا تو میں سب کچھ بھول بھال گیا۔ باں البتہ وہ سارا دن میں نے اماں کو گھر کے کام کاج کرنے ساتھ ساتھ روتے دیکھا۔ میں نے سمجھا، اماں کو بھی میری طرح بابا یاد آرہے ہیں۔

”ماں! تو کیوں جا رہی ہے؟“ ماں کے پاس کیوں کا جواب صرف آنسو تھے۔

پھر ماں ہم دونوں کو چھوڑ کر ماسی صفورا کے ساتھ چلی گئی۔ ماں کو ماسوں کے گھر چھوڑ کر ماسی صفوراں ہمارے پاس آگئی تھی۔ بالآخر روتے روتے آخر مجھے خند آئی گئی کہ اچانک شور سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا چھوٹا سا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور چچا چچ چچ کر سر پیٹ رہا تھا۔

”اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا اندر جل رہا ہے۔ میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے آج تیری بار کسی غیر مو کو اندر آتے دیکھا ہے۔ ارے میرے غیرت مند بہادر بھائی کی عزت یوں ٹل رہی ہے۔ میری بھر جالی بے غیرت ہو گئی ہے۔“

اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کو گولی مار دوں۔ الزام کی سنگینی کا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ مگر اس کی وجہ سے میری ماں مجھ سے دور ہو گئی تھی۔ تب ہی ماسی صفوراں مشتعل ہو کر اٹھی تھیں۔

”قاہر! شرم کر، عزت والے یوں شور مچا کر گاؤں کو اکٹھا نہیں کرتے۔ ارے ایسا غیرت والا ہے تو حفاظت کر، بھائی کی عزت کی ڈھنڈور اکیوں پیٹ رہا ہے۔“

”ماسی تو چپ کر۔ ہم اندھے نہیں ہیں۔ اسے کو کرے سے باہر نکلے تاکہ ایک فیصلہ تو آج ہو ہی جائے۔“

”مگر وہ آدمی کہاں گیا؟“ تب ہی ایک بزرگ نے پوچھا۔

”ارے چاچا! جب تک میں آپ لوگوں کو بلاتا۔ تب تک بھاگ گیا وہ۔“

”بچھوڑے کی طرف اس کے پاؤں کے نشان موجود ہیں۔“ ایک آدمی نے گواہی دی۔

”جھوٹ بولتا ہے یہ۔ میں خود مریم کو اس کے بھائی کے گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ مولوی صاحب! آپ لوگوں کے ساتھ جا کر اس کے بھائی کے گھر سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ ماسی صفوراں نے بڑی فائنہ نظروں سے

کر دیا۔

ایک بار پھر میں اور ماں ساری رات جاگتے رہے۔ دوسرے دن ماں نے ایک پنی خالی کر کے اس میں اپنا سلان رکھا اور مجھے لور شیرو کو لپٹائے روٹی رہی۔ دوسرے وقت بچا آگیا۔ آتے ہی اس نے شیرو کو پیسے پکڑائے اور کہا۔

”جاؤ کھاؤ پیو لور مین کو بھی ساتھ لے جاؤ۔“ شیرو تو چلا گیا۔ مگر میں ماں سے لپٹ کر بیٹھ گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں بچا ماں کو مار نہ دے۔

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور ماں سے کہا۔

”میتا تیرا فیصلہ کیا ہے؟“

”وہی جو تو سنتا آیا ہے۔“ اس صاف جواب نے بچا کو غصے سے دیوانہ کر دیا۔

”تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تجھے پورے گاؤں میں خوار نہ کرایا تو میرا نام بھی قلندر بخش کہیں۔ پھر عزت کے لیے میرے ہی دہ پے آئے گی۔“ وہ مکاری سے مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ ماں ایک بار پھر شدت سے رونے لگی۔

”ماں! بچا تیرا دشمن کیوں ہو گیا ہے؟“ جس بات نے مجھے پریشان کیے رکھا تھا وہ آخر میں نے پوچھ ہی ڈالی۔

”میرا تو اپنا روپ ہی دشمن ہو گیا ہے۔“ ماں نے روتے ہوئے کہا اور دوپٹے سے منہ پونچھ کر رسات سے کہا۔

”دیکھ مین! تو میرا بڑا پیارا بیٹا ہے اور شیرو سے زیادہ سمجھ دار ہے میں مغرب کے بعد تمہارے ماسوں کے ہاں چلی جاؤں گی۔ تم اپنا اور شیرو کا بھی خیال رکھنا۔ شیر علی ذرا لاہوا ہے۔“

یوں ہم ماں بیٹا دکھ بانٹتے رہے۔ مغرب کے بعد ماں نے اپنے ہاتھ سے ہم دونوں کو دودھ چا دل کھل کر چارپائی پر بستر لگائے۔ تب ہی پرپوس کی ماسی صفوراں آئی۔

”ہم دونوں دور ہے تھے۔ شیر علی بار بار پوچھ رہا تھا۔“

بابا کے بعد جیسے تیسے تین سال گزر ہی گئے۔ میں اب دس سال کا ہو گیا تھا اور میرا بڑا بھائی شیر علی تیرہ برس کا۔ اب میں اور شیر ایک ہی چارپائی پر سوتے تھے۔

اور پھر ایک رات میری زندگی میں ایسی آئی کہ جس نے میرے اندر نفرت کا بیج بو دیا۔ ماماوس تو انڈوں پر میری آنکھ کھلی تھی۔

”دیکھ، تو بھی جوان ہے۔ میں بھی جوان ہوں۔ میری بات مان لے۔“

”شرم کر، شرم کر“ میں تیرے بھائی کی عزت ہوں۔“ ماں نے روتے ہوئے کہا۔

”ہونہ مرے ہوئے کوئی سے لگائے بیٹھی ہے اور یہ زندہ تجھے نظر نہیں آتا۔“ تب ہی ماں نے کھٹی کھٹی تسک لی تھی۔

”دیکھ مریم! مرا ہے تو غلام علی پر تو تو زندہ ہے۔“

”ہاں بس ایک۔“

”مت کہہ مریم! بھر جالی ہوں میں تیری۔“ ماں نے بچہ ہی میں اس کی بات کالی تھی۔

”بس بس بھائی مرا تو رشتہ بھی مر گیا۔“

”اچھا رکھو والا ہے تو اپنے ہی گھر میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔“

”چل نہیں لگا تا گھات بس پھر مجھ سے نکاح کر لے۔“ چچا کی آواز میں جھنجھلاہٹ آگئی تھی۔

اچانک مجھے اپنے پاؤں پر بوجھ محسوس ہوا۔ وہ ماں تھی جو اپنی چارپائی سے سرختے سرکتے ہماری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں خوف سے سینے میں شرابور تھا کہ چچا کو محسوس کر ماں کی جانب بڑھتے دیکھا۔ میں نے ایک دم اٹھ کر ماں کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور چچا چچ کر رونے لگا۔ میرے اچانک چہنچہ پر اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ تب ہی اس نے انگلی اٹھا کر ماں کو دھمکی دی۔

”کل میں تمہارا فیصلہ سننے اور اپنا سنانے کوں لگا۔“ وہ چلا گیا۔ ماں نے مجھے تھپک تھپک کر چپ

چچا کو دیکھا۔
اور قادر بخش کو لگا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی
بازی ہار گیا ہے۔

میں ابھی ابھی شنوائی سے واپس آیا ہوں۔ میرا
کیس چالان ہو گیا ہے۔ عدالت نے سات دن کا
ریمانڈ دیا ہے۔ صوبیدار کریم بخش مجھ سے پوچھ گچھ کیا
کرتا میں نے تو پہلے ہی اعتراف کر لیا تھا۔ عدالت میں
ہی ادا شیر سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رو
رلا۔ اس وقت مجھے برا غصہ آیا۔ سپاہیوں کی زیر لب
فحش بات پر میں نے سارا غصہ ادا شیر پر ہی نکال دیا۔
”کیوں رو رہا ہے میں مر گیا ہوں کیا؟“
”ہیسا نہ کہہ میرن! مجھے دکھ ہوتا ہے کہ تیرا گھر آج
گیا۔ پتا نہیں تجھے کیا سزا ملے۔ تو نے بڑی جلدی
کی۔“

”بس ادا بس۔ میں بے غیرت بن جاتا، چھوڑ دیتا
انہیں؟ میں نے وہی کیا جو ایک غیرت مند کو کرنا
چاہیے۔ کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں نے جو بھی کیا وہ
صحیح کیا اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔ وہ کاری
تھی۔ گندی انگلی تھی اور گندی انگلی کاٹ دینا ہی بہتر
ہے۔“ غصے سے میرا چہرہ تپ گیا۔ تب ہی صوبیدار نے
مجھے جلنے کا اشارہ کیا اور اب میں یہاں بیٹھا سوچ رہا
ہوں کہ میں نے تو اپنے بچوں کے بارے میں بھی نہیں
پوچھا کہ وہ کیسے ہیں۔ بھلا کیسے پوچھتا۔ اسے رونے
سے فرصت ملتی تو خود ہی بتا دیتا۔ اس کے رونے کا سوچ
کر ایک بار پھر مجھے غصہ آ گیا۔

”آخر کیا ضرورت تھی اسے عورتوں کی طرح
رونے کی۔“ اس کی فکر مندی اور ہمدردی مجھے اس
وقت زہر لگ رہی تھی۔ کیا میں ہمدردی کے قاتل تھا۔
میں تو داد دینے کے قاتل تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ مجھے
شکایت دیتا کہ میری غیرت کے آگے مجھ کی محبت زنجیر
نہیں بنی تھی۔ بھلا محبت پر غیرت تو قربان نہیں کی جاتی

تھیں۔

پتہ نہیں امل نے ملا کو کیا کہا کہ پھر کبھی ہم
نے امل کو ہمارے ہاں آنے نہیں دیا۔ ہم... نہ...
کے گھر جاتے اور امل سے مل کر چلے آتے۔ پتہ پز
تو اکیلے گھر میں ہمیں ڈر لگتا پھر آہستہ آہستہ ہمارا
گھر۔ دو وقت کی روٹی ہمیں چچا کے گھر سے مل جاتی۔
صبح چائے سے روٹی کھا کر ہم اسکول چلے جاتے۔ در
سے سیدھا چچا کے گھر آکر کھانا کھاتے۔ پھر امل
پاس چلے جاتے میں صبح سے لے کر اب تک کی رو
سنا۔ شیر علی تو بس زمین میں نظریں گاڑ۔ بیٹ
رہتا۔ امل میری باتیں سنتی۔ روتی جوڑتے جوڑتے
مسکراتی جاتی پھر اٹھ کر ہم دونوں کو باری باری پر
کرنے لگتی۔ اس وقت میرا دل چاہتا کہ امل یوں ہی
مسکراتی، ہمیں پیار کرتی رہے۔ مگر میری یہ چھٹی
خواہش پوری نہیں ہوئی۔

اور پھر چوں توں ایک اور سال گزر گیا۔
شیر علی پانچ جماعتیں پڑھنے کے بعد زمینوں پر چچا
ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ میں نے پانچویں میں پہلی پوزیشن
تو سیدھا دوڑتا ہوا یہ خبر امل کو سنانے آیا تھا۔ امل نے
مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا تو میں نے امل سے وعدہ
کیا کہ میں آگے بڑھوں گا۔ مگر گھر آیا تو دیکھا چچا امل
ہاتھ میں لیے میرا منتظر تھا۔

”شیر آگے نہیں بڑھا تو کیا ہوا۔ میں اپنے میرن کو
بہت سارا پڑھاؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“ جیسے ہی چچا
میری طرف بڑھا میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔
”میں آگے نہیں بڑھوں گا۔“ میں نے نیچے سر
ہوئے لٹوؤں پر نظر ڈالی اور دوڑتے ہوئے بات کر
گیا۔ زندگی میں پہلی بار چچا کا چہرہ تاریک ہوتا ہوا
بہت خوش تھا۔ اسی خوشی میں چچا خیر کے بانٹ
ڈھیر سارے آم کھا کر سارا دل ملی ڈنڈا اٹھیلایا۔
پھر بہت دفعہ امل نے مجھے سمجھایا، اپنی خوش

ہٹھار کیا۔ مگر میری ناں ہاں میں نہیں بدلی۔ آخر زندگی
میں پہلی بار میں نے چچا کی بات رد کر کے اس کو مات دی
تھی۔ فی الحال وہ لمحہ وہ مات میری زندگی کا حاصل تھا۔

”میرن! تم سزائے موت سے بچ جاؤ گے۔“ شیر
نے خوش ہو کر مجھے بتایا تھا۔ میں حیرت سے اس کی
خوشی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھا مجھے یقین نہیں آ رہا۔
”ابھی ابھی میں تمہارے وکیل سے مل کر آ رہا
ہوں۔ اس نے مجھے پکا یقین دلایا ہے کہ یہ غیرت کا
کیس ہے۔ اس لیے تمہیں پھانسی نہیں ہوگی اس
نے کہا ہے کہ وہ کوشش کرے گا کہ تمہیں سزا بھی کم
سے کم ملے۔“ اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ پرجوش ہو گیا۔
تو میں نے بھی مسکرا کر سلاخوں کو پکڑے اس کے
ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ میرے اس عمل سے وہ
خوش ہو گیا۔

میں نے سارہ اور علی کا حال پوچھا تو وہ خوشی خوشی
ان کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتے لگا۔
”دونوں بچے کافی حد تک سنبھل چکے ہیں۔ ویسے
بھی پہلے ہی وہ ہم سے مانوس تھے۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی اور مقتول یادو کے
بھائیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔
ہاں میرن! ان کا تو پورا پورا زور ہے کہ تمہیں پھانسی
ہو جائے پر تو فکر نہ کر۔ میں بھی پیسہ پانی کی طرح بہا رہا
ہوں۔ ایک نہ ایک سون تو آزاد ہو جائے گا۔“

”ہاں لولا! آزاد کیوں نہ ہوں گا۔ کوئی گناہ تھوڑی کیا
ہے۔ غیرت کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ میں نے
نرت سے کہا۔“

اس پہلی مات کے بعد مات چچا کا مقدر بن گئی۔ میں
نے ہر اس کام سے انکار کیا جو اس نے کرنے کے لیے
کہا۔ ہر وہ کام کیا جس سے اسے رنج پہنچا۔ ان سات
ملال میں میری ذات سے کوئی خوشی چچا کو نہیں ملی۔
اسے دکھ دینا میری واحد تفریح تھی۔ اس کی ہر بات پر

میرے انکار نے اسے مجھ پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا
مگر صرف دو بار۔ پہلی بار میں مار کھا کر چپ ہو گیا۔
دوسری بار میں نے اس کے ہاتھ روک دیے تھے۔
پندرہ سال کی عمر میں لور تیسری بار کی نوبت ہی نہیں
آئی۔ اسے شاید یقین ہو گیا تھا کہ دوسری بار اسے
ہوئے ہاتھوں کو روکنے والا تیسری بار اپنے رکے ہوئے
ہاتھوں کو اٹھا بھی سکتا ہے۔

یوں بے دریغے شکستوں اور مات و رمت نے
اسے غمگین کر دیا تھا۔ وہ میری ہر بات بلا چوں و چرہں
مان لیتا تو مجھے اور غصہ آتا۔

اس وقت وہ کھانا کھا رہا تھا۔ جب میں تن کر اس
کے سامنے جا کھڑا ہوں۔

”بہت کھالیا ہماری زمین سے اب دلہن کر۔“
نوالہ اس کے گلے میں اٹک گیا۔

ابھی چھوٹا ہے تو۔ کیسے سنبھالے گا زمین۔“ اس
نے مجھے غصے سے دیکھا۔

”کیوں تو جوہ سال کی عمر میں سنبھل سکتا ہے۔ میں
انہیں کاہو کر نہیں سنبھل سکتا۔“

”پچھن دیکھ اپنے۔“ وہ بڑبڑاتا رہا۔
مگر میری نظریں چچا کا زرد پڑا چہرہ دیکھ چکی تھیں۔

مجھے تو ایک بہانا چاہیے تھا تنگ کرنے کا مگر میری حیرت
کی انتہا نہ رہی جب دوسرے دن ادا شیر نے مجھے میں
ایکڑ زمین دکھائی جو چچا نے دی تھی۔ میں پریشان ہو کر
دوسرے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ ٹھیک تین دن بعد میں
پھر چچا کے سامنے تھا۔

”کہاں سے زمین آباد کروں گا؟ سارا کچھ تو تو ہڑپ
کر گیا۔“ ایک بار پھر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب
چپ چاپ اس نے پانچ ہزار نکال کر میری ہتھیلی پر
رکھے۔

اب چار و ناچار مجھے زمین آباد کرنی پڑی۔ ساری
بے فکری ہوا ہو گئی۔ سارا دن زمین میں تیل کی طرح
جسارتا۔ جس کا پھل جلد ہی مل گیا۔ میری جیبیں
پیسوں سے ہر وقت بھری ہوتیں۔ جب ڈھیر سارے
پیسے جا کر امل کی ہتھیلی پر رکھتا تو خوشی سے اس کی

آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ میں اس سے گھرواپس
چلنے کے لیے اصرار کرتا۔ مگر اس کی 'نہیں' ہاں میں
تھیں بدلی۔ میری طرح اس کے وجود سے بھی ان تین
راتوں کی چھاپ نہیں مٹ گئی تھی۔

شیر علی کے فیصلے نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔ میں اس
سے لڑ کر سیدھا حالیاں کے پاس چلا آیا۔
"وہ قادی کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے۔" میں اماں
کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"شیر علی کی بات کر رہا ہے؟" اماں نے ایک کمری
نظر مجھ پر ڈال کر کہا۔

"ہاں ساری لڑکیاں مرگئی ہیں کس۔"
"ٹھیک کر رہا ہے وہ۔ کیا برائی ہے اس میں؟" اماں
نے سچ میں ہی میری بات کالی۔
"میں دیکھ رہی ہوں میرن! تو حد سے گزرتا جا رہا
ہے۔ تیرا چچا ہے وہ۔ نام مت لیا کر اس کا۔" اس نے
رسانیت سے کہا تو مجھے طیش آگیا۔
"اماں! بھول گئیں اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟"
پھر بھی میں اسے سچا کہوں؟

"بس کر میرن! خبردار جو آئندہ یہ بات تیرے منہ
سے سنوں۔"

میں نے اماں کو پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تو حیران
رہ گیا۔ اس کا لٹا اثر ضرور ہوا کہ پھر کبھی بھی میں نے
اماں کے سامنے قادی نہیں کہا۔

شیر علی کی شادی پر جب اماں آئیں۔ تو پھر میرا غصہ
بھی اتر گیا۔ کسی بہانے سے اماں اپنے گھر تو آتی نا۔
اب میری کوشش یہی تھی کہ وہ مستقل ہمارے ساتھ
رہے۔ مگر وہ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی خوف
اس کے وجود سے لپٹا ہوا تھا۔ اب تو ہوسو بھی تھی۔ مگر
تھی تو اسی دشمن کی بیٹی نا۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ اماں پر
قادر پر شیر علی پر اور اپنے آپ پر۔ آخر جوان بیٹوں
کے ہوتے ہوئے انہیں ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔
پھر اس جھنجھلاہٹ میں مجھے ایک خیال آیا کہ کیوں نا

میں بھی شادی کر لوں۔ پھر وہ شاید ہمارے ساتھ رہے۔
پر تیار ہو جائے۔ جب میں نے اماں سے یہ بات کہی۔
خاموش ہو گئی۔ میں اس خاموشی کو رضامندی سمجھ۔
اب مسئلہ یہ تھا کہ شادی کس سے کرتا۔ جب اماں نے
یہ مسئلہ بتایا۔ تو اس کے مشورے نے میرے
بدن میں آگ لگا دی۔

"ہاں میرے لیے وہ تمہاری سڑیل سی سالی ہی رہ
ہے نا۔" میری اس بات پر باورچی خانے میں بیٹھی
بھرجاکی نے نور سے برتن پٹختے پٹختے گوکہ اماں نے
بیشی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ پر مجھ پر اس کا کوئی
تأثر نہیں ہوا۔

"دشمن کی بیٹی کو تو بیاہ لایا ہے۔ اب چاہتا ہے۔
میں بھی ساہنی سے بیاہ رہ چالوں۔"
"کیوں ہے وہ دشمن باپ کی طرح چالا ہے اس نے۔
ہمیں۔"

"ہاں بھلا میرے باپ نے آخر بگاڑا کیا ہے تمہ
کہ اتنے احسان فراموش ہو گئے ہو؟" بیوی نے نور
شیر کی تان میں تان ملائی تھی۔

اور جواب میں ان دونوں کو استغناء سے
کہ میں باہر چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ قادی کی خواہش ہوں
کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کر لوں تاکہ اس کی نور
بیٹیاں اماں کے رہنے کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔ یہ
سازش میں کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہونے دوں
گا۔

پھر یوں نجمہ میری زندگی میں آگئی جو اماں کی بیٹی
تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ دونوں ہوسو میں اماں کی دیوالی
تھیں۔ نجمہ تو خیر اس کی گود میں ملی تھی۔ بھلے سے ماں
کا سلوک نوکرانیوں جیسا ہوا۔ مگر اماں نے کبھی بھی ان
کی اولاد کی محبت میں کمی نہیں آنے دی۔ محبت
دوانے بچے دوڑے دوڑے اس کے پاس آتے۔
انہیں کلیجے سے لگا لیتی تھی۔ مگر بھرجاکی کی محبت میری
سمجھ سے باہر تھی۔ مجھے لگتا کہ اس کی محبت تین
سازش چھپی ہوئی ہے مگر کوئی برانہ پا کر میں
بار کران کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

دس سال کے بعد مجھے خوشیاں ملی تھیں۔ اماں کو
گھر میں دیکھ کر میرا سہیروں خون پڑھ جاتا۔ میں کھانا بھی
انہیں پاس بٹھا کر کھاتا۔ نجمہ کی محبت نے مجھے اور
خوش مزاج بنا دیا تھا۔ زندگی بڑی تیز ہو گئی تھی۔ دن پر
لگا کر اڑ رہے تھے۔ دوسرا اتنی جلدی گزر گئے کہ پتا ہی
نا چلا۔ شیر علی کے گھر بیٹا ہوا تو اماں کو میری اولاد کی فکر
ہونے لگی۔ میں ہنس کر کہتا۔
"اماں! اولاد بھی ہو جائے گی۔ اتنی جلدی کیا
ہے۔"

دو سالوں میں ہم نے تین گھر بھی بنوائے اور ٹریکٹر
بھی لے لیا۔ ہم دونوں کی محنت پر زمینیں سونا اگلتی
تھیں۔ پچھلے سال کی فصل بہت اچھی ہوئی تو ہم نے
اور زمین خرید لی۔ ہماری خوشحالی روز بروز بڑھتی جا رہی
تھی۔ اپنا اثاثہ دودھ کے لیے بھینسیں۔ گھر میں ہر
طرح کا ساز و سامان۔ کہیں رشک ہوتا۔ کہیں حسد اور
کہیں نظر پھر شاید یہ تینوں چیزیں ہماری خوشیوں کو کھا
گئیں۔

پھر ٹھیک پانچ برس کے بعد غلام علی کی آمد ہوئی۔
غلام علی بابا کا نام تھا۔ جب او شیر کا بیٹا ہوا تو اس نے چاہا
تھا کہ یہ نام وہ رکھے۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ بابا کا نام میں
رکھوں گا۔ تو اس نے بھی ضد نہیں کی اور اپنے بیٹے کا
نام رضارکھ لیا۔

علی کی مبارک دینے سارا گاؤں آیا۔ سارے گلوں
میں بیٹھے چاول باٹنے لگے۔ والی نے علی کے پیروں اور
کلا یوں میں دھاگے باندھے۔ پھر ویسے ہی کالے
دھاگے نجمہ کی کلا یوں میں باندھے تو مبارک مبارک
کا شور ہونے لگا۔ میں نے پانچ سو روپے نکال کر والی کو
دے دیے۔ عورتیں شگن کے طور پر خود بھی کلا یوں میں
دھاگے باندھ رہی تھیں۔ تب ہی چچا نے بھی اپنی
کلائی والی کے آگے کر کے دھاگا باندھ لیا۔ عورتیں
"پنے منہ پر رکھ کر ہنسنے لگیں تو مجھے بھی ہنسی آگئی۔

میرے ہنسنے پر چچا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔
مجھے یاد ہے ہزاروں سالوں میں پہلی بار میں نے
انہیں مسکرا کر دیکھا تھا اور شاید میری آنکھوں میں
نقارت بھی نہیں تھی۔ نہ ہی انہیں دیکھ کر غصے کا اظہار
کیا تھا۔

چھوٹے سے غلام علی میں سب کی جان تھی۔ علی
ایک سال کا ہوا تو میرے گھر سارا آگئی۔ یوں میری
کائنات مکمل ہو گئی تھی۔

جب تک دونوں بچوں کو دیکھ نہ لیتا سکون نہیں ملتا
تھا۔ وہ دونوں میری زندگی تھے۔ اب میں اپنی زندگی
سے بہت مطمئن اور خوش تھا۔ اب تو سکیمہ بھی
ہمارے گھر آنے جانے لگی تھی۔ وہی جسے میں نے
سڑیل اور ساہنی کے خطاب سے نوازا تھا۔ وہ نجمہ کی
گھری دوست بن چکی تھی اکثر وہ ہستر ہمارے گھر میں
پائی جاتی۔ ایک روز میں نے یونہی نجمہ کو چھیڑ کر کہا۔
"کیا بات ہے۔ تم دونوں میں آج کل بڑے راز و
نیاز ہو رہے ہیں۔" تو ایک دم اس کے چہرے کا رنگ
زرد ہو گیا۔

"نہ۔ نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ارے رے تو تو ٹیک دم پریشان ہو جاتی ہے۔ میں
تو ذائقہ کر رہا تھا۔ کھواب تو میں نے چچا کو گھورنا بھی
چھوڑ دیا ہے۔ لگی تو تو ذائقہ بھی نہیں سمجھتی۔" میں
نے اس کے سر پر ہلکی سی چست لگائی تو کہیں جا کر اس کی
رک ہوئی سانس بحال ہوئی۔

مجھ میں کالی تبدیلی آگئی تھی۔ میرا رویہ آہستہ
آہستہ بدل رہا تھا۔ جاس نے میرے گھر کے
ماحول پر بھی اچھا اثر ڈالا تھا۔ میری جنت میری ماں
اب میرے سامنے تھی۔ پیار کرنے والی بیوی محبت
کرنے والا بھائی اور گھر میں کھیلتے کودتے بچے۔ اتنے
سارے رشتوں اور محبتوں نے زندگی پر دنیا پر اور
رشتوں پر میرا اعتماد بحال کر دیا تھا کہ وہ منحوس
راست۔ ہاں اس دن اماں اور بھرجاکی شیر کے ساتھ
دوسرے گلوں شادی میں شرکت کرنے گئے تھے اب
وہ منحوس لمحہ۔ منحوس پل کہ جب مجھے پیاس لگی تھی

اور 'لور میری آواز پر اس کا کوئی جواب نہ پا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ پھر۔۔۔ پھر غیرت کے دھوڑنے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ کھانڈی نے اپنی پیاس بجھائی تھی۔



آج میں پہلی بار رویا ہوں۔ ہاں 'خوب رویا ہوں۔ پہلی بار مجھے یاد آئی ہے اس کی موت پر پہلا آنسو بہایا ہے۔ ڈیڑھ سال بعد۔ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگوں کے عزیز چھڑتے ہیں۔ تو وہ اسی وقت حشر چا دیتے ہیں۔ مگر میں اپنی عزیز بیوی کی موت پر ایک سال بعد رویا ہوں۔

لوگوں کے لیے قیامت موت کے بعد ہوگی اور میرے لیے زندگی ہی قیامت بن گئی ہے۔

بھلا کوئی ملی اپنے ہی ہاتھوں لگائے ہوئے باغ کو اجاڑتا ہے۔ نکا نکا کر کے آسمانہ بنانے والا۔ اپنے آسمانے کو اپنے ہی ہاتھوں جلا کر بھسم کر دیتا ہے؟ نہیں ہاں میں نے یہ دونوں ہی کام کیے ہیں۔ بھسم شدہ آسمانے کی دھول اڑ کر میری آنکھوں میں چسپی ہے۔ تب ہی مجھے احساس ہوا ہے۔ ہاں میرا سگا۔ میرا ماں جایا۔ آج مجھے کیا کہہ گیا ہے۔ ایک سال سے اس سے یہ بات کہہ رہا تھا۔

"اوا! سارہ کو رضا کے نام کرو۔" وہ ایک سال سے یہ بات ٹال رہا تھا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ سارہ ابھی چھوٹی ہے۔ یا تو آزاد ہو جائے تو پھر دھوم دھام سے منگنی کریں گے اور آج جب مجھے زندگی کی خوشخبری ملی ہے۔ تو وہ مجھے موت کی لوید بھی سا گیا۔ جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔

آج میری آخری پیشی تھی۔ میرا کیس چونکہ غیرت کا تھا۔ دونوں محنتیوں کو میں نے آنکھیں ایک ہی جگہ پر قتل کیا تھا۔ یاد کے جان بچا کر دوڑتے ہوئے قدموں کے نشان ایک ہی آگڑا دروات خود ہی گر قمار دینے کا عمل اور ساری گواہیاں میرے حق میں گئی تھیں۔ گو کہ یاد کے بھائیوں نے کافی زور لگایا کہ مجھے

بھانسی ہو جائے۔ مگر شیر نے پیس پانی کی طرح بہایا تھا۔ بھینیس ٹریکٹر اور ساری جمع پونجی خرچ تو ہو گئی۔ مگر وہ میری زندگی بچانے میں ضرور کامیاب ہوا تھا۔ بھاری چرمانہ اور سات سال قید با مشقت میرے جرم کی سزا تھی۔

مگر جو سزا آج مجھے ادا شیر دے گیا ہے۔ وہ اس سزا سے بہت زیادہ ہے۔ یہ سزا صرف سات سال بھگتنا ہے اور وہ جب تک سانس گلے میں اٹکی ہوگی تب تک بھگتنی ہوگی۔

عدالت سے جب ڈسٹرکٹ جیل پہنچا تو کچھ دیر بعد ہی اوا شیر ڈھیر سارے مٹھائی کے ڈبوں سمیت آگیا تھا۔ سارے عملے کو وہ مٹھائی اور خرچی دے کر میرے پاس آیا تھا۔ اب خوشی خوشی مجھے تفصیل بتا رہا تھا کہ کتنی منت کی دیکیں چڑھائی ہیں 'صدقہ دینا ہے' مٹھائی بانٹنا ہے۔ تب ہی میں ایک بار پھر اس سے کہہ بیٹھا۔

"اوا! سارہ کو رضا کے نام کرو۔" اچھا ہے کہ کم عمری میں ہی ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے۔ اس نے سر ہلا کر آہستگی سے کہا تھا۔

"میرن! بات یہ ہے کہ تیری بھرجائی ایسا نہیں چاہتی۔"

"ایسا۔۔۔ نہیں چاہتی۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ۔۔۔ یہ کہتی ہے کہ سارہ کاری کی بیٹی ہے۔ نجمہ بد چلن تھی۔" اس نے نظریں چڑا کر ایک ٹھہری سانس لی تھی۔

"مگر۔۔۔ تو فکر نہ کر میں اسے آہستہ آہستہ راضی کر لوں گا۔ بس تو اس کام میں جلدی نہ کر۔" پر میں؟ کاری کے پھندے کو دیکھ رہا تھا جو میرے گلے میں پھنسا ہوا تھا کہ اچانک سامنے سے سارہ آگئی۔ وہ پھندا اس کے گلے میں اٹک گیا۔ اب میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کون سے دلا سے در تسلیاں دیتا رہا۔



اک بار پیشی پر اوا شیر کو روکتے دیکھ کر مجھے غصہ آیا تھا کہ وہ عورتوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی میرے سامنے نہیں رویا اور اب اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ گزرے تین سالوں میں شاید ہی کوئی رات ہو جب میرا تکیہ نہ بھیجا ہو۔ دل نے دہائی بند دی ہو اور میں نے اپنے آپ کو لعن طعن نہ کیا ہو۔ وہ لہو احساس کہ "سارہ کاری کی بیٹی ہے" یہ الفاظ تیر بن کر میرے دل میں پیوست ہو گئے تھے 'ناسور بن گئے تھے۔ اب یہ ناسور رستا رہتا ہے۔ کوئی مرہم نہیں کوئی دوا نہیں کوئی مساجا نہیں کہ جو اس پر پھائے رکھے۔ یہ زخم میں نے خود چننا ہے گلہ و شکوہ کروں تو کس سے کہنے آپ سے؟

مگر میرے پار میں کہیں کی رہ گئی تھی۔ وہ بچوں کی ماں ہو کر اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ اگر کی ہی تھی تو مجھے پتا نہ چلتا۔ کاش کہ اس رات مجھے پیاس نہ لگتی تو میری آنکھ بھی نہ کھلتی۔ مگر کھلی ہی تھی تو میں گھر سے باہر نہ جاتا۔ گھڑا عتبہ دیکھ کر یہ یقین کر لیتا کہ وہ پانی بھرنے گئی ہے۔ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا مگر میں اپنی اس چھٹی جس کا گلیا کرتا جو اسے نہ پا کر مستعد ہو گئی تھی اور میں وہ کام کر بیٹھا کہ جس نے بہت ساری زندگیوں کو زندہ در گور کر دیا۔ میری پیاری سی بیٹی کی پیشانی کو داغ دار کر دیا۔ میری بے گناہ ہتھکڑیاں سارہ کو کاری کی بیٹی کہہ کر رو کر دیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ کسی کی بیٹی کو رو کر کتنا تکلیف دہ عمل ہے۔ میں نے بھی تو چچا کی بیٹی کو سڑیل اور سانپنی کہہ کر رو کر دیا تھا۔

مکافات عمل اتنی جلدی کیوں آجاتا ہے کہ ہمیں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں سوچتا ہوں 'میری ذات سے تو کسی کو بھی خوشیاں نہیں ملی ہیں۔ اماں کو بھی نہیں کہ جسے اس کائنات میں سب سے زیادہ چاہنے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اس نے مجھے پڑھانے کی خواہش کی تو میں نے وہ بھی پوری نہیں کی۔ یہی کرتا تھا میں تو اس "ملت" میں ایسا لکھو یا کہ پھر اس کے حصار سے نکل ہی نہ سکا۔

پھر کیا کاری زخم دیا تھا اماں کو۔ اس کی گودوں پہلی

پیاری بھینجی کو قتل کر دیا۔ اس بھائی کی بیٹی کو کہ جس نے اس کی عزت و حرمت پر آج نہ آنے دی۔ جس نے اس کی بیوی کے بار کو اپنے ناکوں کندھوں پر ڈھویا تھا۔ اپنی غرمت و بے کسی کے باوجود۔ بس کے وجود پر کوئی انگلی نہ اٹھنے دی مگر میں نے ان دونوں۔ بس بھائی کے لیے کروٹ کروٹ کانٹے بچھا دیے ہیں۔ میں نے کسی کے لیے بھی سکھ کاشت نہیں کیے۔ جی کہ اپنے لیے بھی نہیں۔ دو سروں کے لیے درو کی فصل بوئی تو خود بھی وہی کافی۔ ساری عمر نفرتوں کی آبیاری کرتا رہا اور یہ بھول گیا کہ یہ ایسی چلچلائی دھوپ ہے جو تن من جھلسا کر کوئلہ بنا دیتی ہے۔ ایسا کوئلہ جو ہوا کے کسی نامہاں جھونکے پر چنگاریاں اڑا کر دو سروں کے قلب و جسم میں سوراخ کر دیتا ہے۔

پچاسب سے زیادہ میری نفرت کا شکار تھا۔ کیسے نہ ہوتا۔ آخر میرے اندر اسی نے تو نفرت کاشت کی تھی پھر مجھے یاد نہیں پڑا کہ کبھی اس کی کوئی بات مانی ہو۔

اب میں نے اپنی آنکھوں سے نفرت کی عینک اتاری ہے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ میں ہر حد پار کر گیا۔ مجرم کو سزا اتنی ہی دینی چاہیے جتنا اس کا جرم ہو۔ میں نے سالوں تک اسے نفرت کی سولی پر لٹکا کر رکھا۔ اس نے باپ بن کر ہمیں پالا ہٹا کے ہماری ہر ضرورت پوری کی۔ میری حرکتوں سے تنگ آکر کبھی ہماری ضرورتوں سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ بار بار گزرے کام لیا۔ کبھی اپنی اولاد کو ہم سے زیادہ نہیں دیا۔ بار بار میں بد تمیزی سے پیش آیا مگر اس نے اپنی اولاد کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اس بات پر مجھ سے ٹپس مگر قصور تو میرا بھی نہیں ہے۔ مجھے کون سی خوشیاں ملیں۔ بچپن میں تپسی کے دھچکے نے لڑکھڑایا پھر میری زندگی کا محور ماں کی ذات تھی مگر چچا کی ہوس نے مجھے اپنے محور سے ہٹا دیا اور یہ تو دستور ہے کہ جب بھی کوئی محور سے ہٹا ہے تو اس کا نتیجہ صرف تباہی و بربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

وہ تین راتیں کسی آسیب کی طرح میرے وجود سے ایسے چٹکی رہیں کہ اس آسیب زدہ من میں کبھی سکھ کا

بہر حال ہوسکا۔ میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ مجھ کو قتل کرنے کا محرک کیا تھا۔ کیا میری ماں کا پاکیزہ انداز زندگی کہ جو اپنے وجود کو کسی مقدس کتاب کی طرح پاکیزگی کے جزو میں لپیٹ کر طلاق حرمت پر سجائے بیٹھی رہی اور میں ساری عمر اس مقدس وجود کو آنکھوں سے لگا کر چومتا رہا تو وہ منظر کیسے برداشت کر سکا کہ جس نے میرے رویوں میں دوسریں میں چنگاریاں بھرو دی تھیں۔

ہو سکتا ہے کوئی پرہیزگار آشور آدمی ہوتا تو وہ اسے رفاقت سے آزاد کر دیتا۔ میں نے اسے زندگی سے ہی آزاد کر دیا۔ صحیح کہتے ہیں۔ نامحرم مرد و عورت کے بیچ میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ شیطان کہ جس نے بڑے عابد و زاہد بھی بہکا دیے۔ وہ تو پھر ایک کمزور عورت تھی، کیسے نہ آتی اس کے بہکاوے میں۔ اب میں سوچتا ہوں واقعی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تھا اگر میں اپنے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دیتا۔ کم از کم میری بیٹی کی پیشانی پر یہ داغ تو نہ لگتا کہ وہ ساری عمر کاری کی بیٹی کہلائے۔ اب تو جہاں بھی بیاہ کر جائے گی جیسی ماں کی بیٹی کے تیوں سے ماری جائے گی۔ زندگی جنم نہ جائے گی اس کی۔

یہ پھندا خود ہی تو اس کے گلے میں ڈالا ہے۔ اب کیسے یہ پھندا اس کے گلے سے نکالوں، کیسے اسے جہنم سے بچاؤں۔

اور علی میرا پیارا بیٹا۔ کیا وہ بھی میری طرح جہنمی بن کر ذہنی مریض بن جائے گا؟

”یا اللہ! میں کیسے ان معصوموں کو بچاؤں، میرے گناہوں کا سایہ بھی ان پر نہ پڑے۔ مالک یہ زمین بھاری زمین پہ آسمان بھاری آسمان پر کائنات بھاری کائنات پر میرے گناہ بھاری اور گناہوں پہ تیری رحمت بھاری۔ میرے گناہ اگرچہ اس کائنات جتنے ہوں مگر تیری رحمت کے احاطے سے باہر نہیں۔ میری رہنمائی فرما۔“ میں نے گڑ گڑا کر دعا کی۔

دن، کالی چٹیل جیسی راتیں گزر گئیں۔ اجازت یادیں! ویران وقت کے پیچھے سے سر اٹھا کر مجھے رلاتی رہیں، تڑپاتی رہیں، سسکاتی رہیں۔ میں ان لمحوں میں مقید ہو کر اپنا حال سمجھتا رہا۔ کبھی دل مدہی بن جاتا تو کبھی ضمیر۔ یوں دل و دماغ میں آنکھ بھولی ہوئی رہی۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ شاید وہ بھی میری آزادی کا جشن منا رہی تھی۔ اذان ہوتے ہی نماز پڑھی۔ ساتھیوں سے باتیں کیں جن کے چہرے اپنی آسیری کو بھلا کر میری رہائی کی خوشی میں دک رہے تھے۔ ایک الوداعی نظر اس بوسیدہ بستر اور اکلوتے گھر پر ڈالی جنہوں نے سات سال وفا بھائی تھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے سات سے دس بج گئے مگر کوئی بھی نہیں آیا تو میں خود جیل سے اجازت لے کر نکل آیا۔

آزاد فضاؤں میں ایک گہری سانس لے کر چوکیدار کو سلام کیا تو اس نے مسکرا کر مبارک بلو دی۔ سارا راستہ میں خیالوں کی کچھڑی پکاتا رہا۔ کوئی بھی مجھے لینے نہیں آیا۔ دوسرے نہیں آئے مگر شیر علی تو آجا۔ تھکا ماندہ ذہن سوچوں کی یلغار سے پریشان ہوتا رہا۔ گاؤں پہنچے پہنچے شام ہو گئی تھی۔ گڈ بندیاں بار بار میرے راستہ روکے کھڑی ہو جاتیں۔ میں عجیب غم و خوشی کی کیفیت میں گھرا رک رک کے آگے بڑھتا رہا۔ جیسے ہی نیم کے درخت کے پاس پہنچا۔ وہ منظر ایک بار چہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

من من بھر کے قدموں کو محسوس کر گلیوں میں پہنچا تو ان کی ویرانی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ کوئی بھی مجھے راستے میں نہیں ملا۔

”سب ہی میرا ماتم کر رہے ہیں کیا؟“

گھر کے اندر پہنچا تو ماں کو خطر پایا۔ کتنی ہی دیر لپٹ کر روتے رہے کہ اچانک میری نظر اک سے سے وجود پر پڑی۔

”ماں! یہ۔ یہ۔ میری سارہ ہے نا؟“

”آجا سارہ! باپ سے تیرا۔“ ماں نے روتے روتے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب

ساخوف بلکورے لے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

”ماں! دیکھو! دیکھو میری سارہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے جب اسے چھوڑا تھا تو کتنی چھوٹی سی تھی۔ علی تو اس سے بھی بڑا۔ ماں اعلیٰ کہاں ہے اور بھر جانی بھی نظر نہیں آئی اور او شیر بھی مجھے لینے نہیں آیا“

کیوں؟“ میں نے یک دم بہت سارے سوال کر دیے۔

”تمہاری بھر جانی اپنے میکے گئی ہے اور علی شیر کے ساتھ ہی نکلا تھا۔ تو بیٹھ! میں تیرے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ اس نے میری پیشانی چوم کر کہا۔ اس کے لیے کوٹھنا ہوا محسوس کر کے میں چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ماں! تو بتاتی کیوں نہیں آوا مجھے لینے کیوں نہیں آیا اور علی کہاں گیا ہے اس کے ساتھ؟“

”سب بتاتی ہوں۔ پہلے تو کھانا کھا کر تھوڑا آرام تو کر لے۔“

”نہیں! میں مجھے بھوک نہیں ہے، پہلے تو مجھے بتا۔“

”کیا بتاؤں؟ اس گھر کو تو کوئی خوشی راس ہی نہیں آئی۔ جرگہ میں گئے ہیں۔“

”جرگہ میں؟ کس کے؟ کیوں؟“

”ہاں جرگہ میں۔ آج فیصلہ ہونا ہے کہ عائشہ گوری ہے یا نہیں۔“

”عائشہ؟ وہ میلن۔ مدھے اٹھاؤ۔“ (میرن مجھے اٹھاؤ) بازو اوپر کر کے تو تلی آواز میں کہنے والی عائشہ (تھوڑا چپاکی سب سے چھوٹی بیٹی) مجھے لگا زخمن میرے ہاتھ کے نیچے سے برک رہی ہے۔

”ہاں میرن! اب ہمارے باندوں میں ایک اور لڑکی کی لاش اٹھانے کی سکت نہیں ہے۔“ میں نے گڑ گڑائی کہا۔

”جرگہ کہاں ہے؟“

”ڈیرے کی اوطاق میں۔“ ماں نے آنسو پونچھ کر

خود بخود میرے قدموں پر کی اوطاق کی طرف بڑھ گئے اور اب ایک طرف او شیر مجھ سے لپٹا رہا تھا تو دوسری طرف سے علی۔ تھوڑی دیر کے لیے جرگے کی کارروائی رک گئی۔ سب لوگ مجھے مبارک دے رہے تھے۔ شام ۷ بجے رہے تھے۔

”ہاں دیکھ غیرت مند اسے کہتے ہیں۔“ آواز آئی۔

”ہاں ہاں! بیٹی کو بچانے کے لیے مرا جا رہا ہے۔“

تائیدی آواز۔

”پتی بھر جانی پر تو جھوٹے الزامات لگاتے نہیں ڈرا۔ اب دیکھو تو بہ تو بہ۔“

آوازوں کی یلغار میں پچا گم صم بیٹھا رہا، سرگوشتیں بڑھ گئیں تو ڈیرے نے سب کو چپ کر دیا۔

”ہاں بابا۔ قادر کی بیٹی کا کاری ہونا ثابت ہو گیا ہے اور سب کو بتا ہے کہ کاری کی سزا موت ہے۔“

”نہیں سائیں! میں۔ میری بیٹی کو کاری مت کرو۔ سائیں! میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں اسے موت کی سزا نہ دو۔“ میں نے زندگی میں پہلی بار چچا کو یوں گڑ گڑاتے دیکھا تھا۔

”نہیں سائیں! اس قادر کی باتوں میں نہ آئیں۔ آج اس کی بیٹی کو سزا نہیں ملے گی تو کل کلاں دو سروں کی بیٹیاں بھی خراب ہو سکتی ہیں۔“ ایک آدمی بھڑک کر اٹھا تھا۔

”نہیں سائیں! میں یہ گاؤں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مجھ سے یہ ساری زمین لے لو مگر میری بیٹی کو بخش دو۔“

چچا نے اپنی پگڑی اتار کر ڈیرے کے قدموں میں ڈالی۔

”ڈیرے نے اک سوچتی نگاہ جرگے پر ڈال کر کہا۔

”ہاں تمہاری بیٹی بچ سکتی ہے۔ اگر گاؤں میں سے کوئی اس سے شادی کر لے۔ کیوں گاؤں والو؟“

”ہاں سائیں! کون اپنی نسل خراب کرے۔“

پھر ایک آواز آئی۔

”ہاں سائیں! گندی نسل کامیوہ بھی گند۔“

”تو سب گاؤں والوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا پھر تو پاپا موت اس کا مقدر ہے۔“ ڈیرے کی مایوس آواز آئی۔

چھا کا رہتا ہوا سرلا، سہل۔ سارے۔ کاری۔
کی بیٹی۔ اس کی آنکھوں کا خوف۔ سرسبز۔
وجود۔ غیرت۔ موت۔ زندگی۔ نیکی۔ ہاں
نیکی۔ میرا وجود تیرے دل میں تھا۔
”سائیں! عائشہ سے میں شادی کروں گا۔“ حیرت
سے اٹھی ہوئی نگاہوں کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ کیا
نہیں تھا ان نگاہوں میں۔ حیرت، نفرت، استغناء، ترس،
ظفر میں تو مشکور نگاہوں میں کھویا ہوا تھا۔ کھنت،
ملاست، نفیجیک کو کیا دکھتا۔

یہ توجہ کیسا تمام زندہ دلن ہے۔ یہ پوری فضا نوحہ کنوں
کیوں ہے۔ ان درختوں کو سکتے کیوں ہو گیا ہے۔ یہ
کیسی سسکیں ہیں۔ سر اٹھا کر اور دیکھا زور کا جھکڑ چلا
تھا۔ اس کا وہ پٹہ اڑ کر چند قدم کے فاصلے پر گر اٹھا۔
”ہاں وجود جب کاری ہو جائے تو پروا میں کب
ساتھ دیتی ہیں۔“ اس نے سوچا۔ اس سوچ پر ہوانے
اک بار پھر احتجاج کیا تھا۔ وہ پٹہ کچھ اور دور ہوا۔ ہوا
نے آخر اتنا حشر کیوں مچا رکھا ہے اور یہ پتے آپس میں
سر کرا کر کیوں دور ہے ہیں اور یہ دھول تیزی سے
میرے جسم سے کیوں گرا رہی ہے۔ کیا مجھے سنگسار
کرنے آئی ہے۔ دھوپ اتنی زور زداری کیوں ہے۔
شاید اسے بھی میرا غم ہے۔ بلبلوں پر کچلی کچلی
طاری ہے، شاید ان سب کو میری بے گناہی کا یقین

ہے۔
تو تو منصف ہے، تجھے تو بتا ہے، میں بے گناہ ہوں۔
مولا! تو بھی میرے ساتھ انصاف نہ کرے گا کیل۔ گھر
میں رہنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ گھر کتنا صاف ستھرا
ہے۔ تو بھی تو میرے دل میں رہتا ہے۔

تو پھر میری ذات پر یہ کیڑا کیسا۔ میں بے موت کیوں
ماری جا رہی ہوں۔ نگاہ امید لوٹ کر نیچے آئی توجہ کھٹ
پر ٹھہر گئی۔ حسرت و یاس، ہناہوں کا وجود اسے ہی تنگ رہا
تھا۔ انہی دیران نگاہوں سے گھبرا کر تو وہ باہر آکر
درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئی تھی مگر وہ نگاہیں اب بھی

اس کے زندہ وجود پر گڑی تھیں۔ شاید۔ دیکھ
تھیں کہ یہی وجود کل سفید کپڑے میں لپٹا ہے۔ ہر
چارپائی پر بڑا ہو گا۔
کیا زندگی اتنی ہی ارزاں ہے کہ کسی بھی جھڑے
بستان پر وار دی جائے۔
”تھیں۔!“ آواز کہیں اس کے اندر سے نکل
تھی۔

”یہ۔ یہ سب لوگ فرعون کیوں ہو گئے ہیں۔
اماں! میں کاری نہیں، تیری بیٹی کاری نہیں ہو سکتی۔
جن کی مائیں تیرے جیسی نظروں کے کڑے پر۔
بٹھانے والی ہوں، ان کی بیٹیاں کاری نہیں
ہو سکتیں۔“ سسکیں اس کے اندر ہی مر رہی تھیں۔
اس نے روتے روتے سلیمہ کو دیکھا جو سینے سے قرن
لگائے رو رہی تھی۔

”لوہی وڈی۔ لوگ کہتے ہیں۔ زندگی ایک بار متی
ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں، یہ بے مول ہے۔“ اس
نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا تو سچ اس۔
ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں جا گری۔

”مہول۔ جھوٹ کہتے ہیں ہاں۔ کون کتا ہے
زندگی انمول ہے۔ مجھ سے پوچھ اس کی قیمت۔ ا۔
جھوٹا بستان، اک الزام۔ کتنی سستی بک رہی ہے
زندگی اور دیکھو، سارا گاؤں خریدار بنا ہوا ہے۔“
اس نے سڑ کر ایک بار پھر سلیمہ کو دیکھا جس نے
رونے میں کچھ اور شدت آگئی تھی۔ اس کے سسکتے
وجود کو ماں کی آغوش نے سمیٹا تھا۔

میں شروع سے ہی لاڈلا اور ضدی تھا اور وہ بھی لدا
غلام علی کا۔ اس نے بھی میری کسی بات کو رد نہیں
کیا۔ میرا معمول تھا کہ اپنے گھر سے ناشتہ کر کے
سیدھا ادا کے گھر جا کر چائے پیتا۔ ہم دونوں باورچی
خانے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ بھر جانی روٹی بناتے بناتے
ہماری باتوں میں بھی شریک ہوتی رہتی۔ میری شادی
ہوئی، بچے ہوئے، تب بھی میرا یہ معمول نہیں بہ۔

جی کہ اوا غلام علی چل بسا مگر میں ویسے ہی بھر جانی کے
پاس جاتا رہا۔ شروع کے سالوں میں انہیں وہی عزت و
احترام دیتا رہا جو ادا کی زندگی میں دیتا تھا مگر کچھ عرصے کے
بعد میری نیت میں فتور آ گیا۔ پہلے پہل تو میں اپنے
آپ سے لڑتا مگر جلد ہی میرے اندر کے شیطان نے
مجھ پر قابو پا لیا۔

کہتے ہیں، عورت بڑی حساس ہوتی ہے۔ نظر بچان
لیتی ہے کہ کس نظر میں احرام ہے، کس میں محبت اور
کس میں ہوس۔

اور میں نے تو پہلی ہی نظر ہوس کی اٹھائی تھی تو وہ
کیسے نہ جان پاتی۔ چند دن کے بعد ہی اس نے مجھے گھر
آنے سے منع کر دیا۔

میرے تو ٹکڑوں سے لگی سر پہ۔ بجھی۔ میں نے اس
کی بات مانی تو نہیں، البتہ اب دوبار جانے لگا۔ پہلی
بار صبح کو دو سہری بار شام کو خوب لدا پھندا جاتا۔
عنایت کی بارش کر دی مگر میرے کسی بھی لالچ نے اس
کے پائے استقلال کو لڑکھڑایا نہیں۔ اب تو وہ دو ٹوک
مجھے روکنے لگی تھی۔ سیدھے منہ بات نہ کرتی، میں
آتا تو اندر جا کر بیٹھ جاتی یا کہیں پڑوس میں چلی جاتی۔

میں ہوس کے گھوڑے پر سوار بائیں شیطان کو
نہماتے۔ ایلہیسی جھکنڈوں پر اتر آیا۔ جب دیکھا کہ
میری کسی بھی عنایت لالچ کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوا
تو میں نے ہاتھ تنگ کر لیا اور نوبت یہاں تک آگئی تھی
کہ بھی کبھی تو ان کے گھر آتا بھی نہ ہوتا۔ اس وقت
میں یہ بھی بھول گیا کہ یہ میرے خیم بیٹھے ہیں۔ میں
کیسے انہیں بھوکا رکھے ہوئے ہوں مگر مجھ پر تو شیطان
مبار ہو گیا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جس پر میں
گڈوں میں بدنام ہو جاؤں، اس لیے اس کی رضا مجھے
مضبوب تھی ورنہ وہ کمزور عورت میرا کیا بگاڑ سکتی تھی
میں چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ
بٹے۔

اس کی آنکھوں میں اپنے لیے واضح نفرت محسوس
کرنے میں اور جل جانا۔ ہر جھکنڈا آنانے کے بعد

اب صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اسے ہر اس
کروں اور یوں اس رات پہلی بار میں اندھیری رات
میں گیا تھا۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ میں خود سہا ہوا تھا۔
آہستہ آہستہ چوروں کی طرح، پھونک پھونک کر قدم
رکھ رہا تھا کہ اچانک میرے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی
تھی اور کمال کی چھٹی جس تھی اس کی کہ اتنی ہلکی سی
آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تب تک میں چارپائی کے
قریب پہنچ گیا تھا۔ لب اسے دھکی دے رہا تھا۔

”تو میرا کیا بگاڑ لے گی۔ آخر کیا کر سکتی ہے۔ ہاں“
میں چاہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں خوف اُترتے
دیکھا تھا۔ اچانک اس نے اپنے ساتھ سوئے ہوئے
میلن کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ بے آواز رو بھی
رہی تھی کہ ننھے میلن نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”میری اماں کو کیوں ڈرا ہے ہو؟“

ایک دم خوف نے مجھے آکھیرا کہ میں وہ چیخ کر
لوگ نہ آکھتے کر لے۔ میں فوراً وہاں سے چلا آیا۔
میں نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب
وہ ہتھیار ڈال دے گی مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ جیسے
جیسے میری اوچھی حرکات بڑھ رہی تھیں، اس سے
کہیں زیادہ اس کی مضبوطی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

کچھ دنوں بعد میں پھر رات کو گیا۔ اب کی بار وہ پہلے
سے جاگ رہی تھی۔ شاید اس رات کا خوف نہیں گیا
تھا۔ میں جا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں ہر طرح
سے اسے پر جھانے کی کوشش کرتا رہا اور وہ مجھے کھری
کھری سناتی رہی۔ میں نے اس سے ٹکڑ کر کے
لیے بھی کہہ دیا پھر بتا نہیں کیسے برکتے برکتے وہ بچوں
کی چارپائی پر چلی گئی اور میری جان کے دشمن بنے
ہوئے میلن کی چیخوں نے ایک بار پھر مجھے بھاگنے پر
مجبور کر دیا تھا۔

وہ نکاح پر بھی راضی نہیں تھی۔ اب مجھے آخری
حربہ آزمانا تھا اس کے بعد وہ خود ہی میرے درپہ آئی اور
عزت کی بھیک مانگتی۔ میں ایک ہی تیر سے دو شکار
کرنے چلا تھا۔ اپنی عزت کا واسطہ دے کر اپنی بیوی کو

بھی راضی کرنا اور اپنے من کی مراد بھی پالیتا۔ میرے منصوبے میں کہیں کوئی کمی نہ تھی۔

میں شام کو دوسرے گاؤں چلا گیا۔ وہاں پہلے سے اپنے دوست کو تیار کر آیا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ رات کو گھر میں آکر دوسری طرف سے چلا جاتا۔ باقی کا کام میرا تھا۔ میں بہت دیر سے دلہن آیا تھا۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ مریم مغرب کے بعد اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھی۔

میری صفوراں کو دیکھ کر مجھے حیرت ضرور ہوئی مگر میں یوں مات کھا جاؤں گا مجھے پتا نہ تھا۔ یوں میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا۔

اور گاؤں والوں کی لعن طعن کا شکار الگ ہوا۔ میں جو اپنی عزت بچا کر اسے رسوا کرنا چاہتا تھا خود ہی رسوا ہو گیا۔ میں منہ اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ اب ایک ہی چارہ تھا کہ مریم کے بھائی کو راضی کر لوں۔ میں نے اس کی بھی منتیں کیں کلاچ دے، زمین دینے کی بات کی کہ اگر مریم کی شادی مجھ سے کرو تو میری عزت بھر سے ہو جائے گی مگر وہ راضی نہیں ہوا۔ اب میری عزت اسی میں تھی کہ میں خاموش ہو جاتا۔ ہاں اب میرے غمے کا شکار اکثر میرن ہوتا۔ میں اسے ڈانٹتا رہتا اور پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کی خود سری بڑھتی گئی اور جب میں نے اس کی دوسری بار پٹائی کی تو میری بیوی مجھ سے لڑ پڑی۔

”کیوں مارتا ہے میرن کو کیا دشمنی ہے تیری اس سے؟“

”اس کی ہٹ دھرمی بھی تو دیکھ، ہر وقت مجھے بیچ کر مارتا ہے۔“ میں نے غم سے کہا۔

”دیکھ اعجاز کے ابا! باپ تو پہلے ہی مر گیا۔ میں کو بھی اپنے کرو توتوں سے الگ کر دیا۔ وہ تو بھلا ہو مولوی صاحب کا درندہ تو تو اسے میں سے ملنے بھی نہ دیتا۔“ بیوی نے مجھے آئینہ دکھایا۔

”شیر بھی تو میرا جھنجھکا ہے۔ جب اسے کلجے سے لگائے بیٹھا ہوں تو اس کے ساتھ مجھے کون سا ہے۔“ مجھ سے پوچھ میں بتاتی ہوں۔ جب تو پہلی رات

اس کے گھر گیا تھا تو وہ تجھے جن سمجھ بیٹھا تھا۔ یہی اس نے صبح آکر تجھے بتائی تھی۔ بس اس رات تجھے اس سے ہیر ہو گیا۔ تیرے ظلم نے میرن کو بے شیر کو بزل ہٹا دیا ہے۔“

”یہ کیا بک رہی ہے؟“

”تو کیا سمجھتا ہے میں تجھ سے غافل تھی۔ سنا، میری بدلتی نظر سب سے پہلے اس کی عورت ہی سمجھتی ہے۔ دنیا سے پہلے عورت جانتی ہے کہ اس کے قدم کن راہوں پر ہیں۔ تو میں اتنی قویہ ہوتے کیسے نہ جانتی مگر مریم کے پریشان چہرے نے مجھے سمجھ دیا کہ خرابی مجھ میں ہے۔ میں نے ہی مریم کو کہہ دیا کہ کچھ دن اپنے بھائی کے گھر چل جا۔ شاید اللہ یہ نیکی مجھ سے ہی کروائی تھی۔ بس میں کہے دیتی ہوں آئندہ میرن کو کچھ بھی نہ کہنا۔“

پھر واقعی میں نے میرن کو کبھی کبھ نہ کہا۔ پہلے وہ کتنا نقصان کر دیتا۔ مجھے اب پتا چلا کہ میری سازش کیسے ناکام ہوئی تھی۔ اب تو میں اپنی ہی نظروں میں آ گیا تھا۔ اب میری ایک ہی خواہش تھی کہ میرن میرے پاس بیٹھے مجھ سے باتیں کرے، شیر جی نہ طرح مگر اس کی پہلے دن بولی نفرت ہنوز قرار تھی۔

پھر اس نے شیر علی کی شادی کی مخالفت کی مگر وہ میں شیر نے مجھے بتایا کہ وہ بھرجائی کے سمجھانے پر راضی ہو گیا ہے۔

پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے خود بھی شادی کرن یوں بھرجائی اب مستقل اپنے گھر آگئی تھی۔ میرن بہت خواہش تھی کہ وہ بھی میرا داماد بنے مگر وہ تو مجھے دشمن سمجھتا تھا۔

بھرجائی کے آنے کے بعد میں کبھی لن کے گھر نہیں گیا۔ کیسے جاتا، مجھے تو اپنے آپ سے ہی گھن آتی تھی پھر جب غلام علی اس کے آگن کی خوشی بڑھا دیا تو میں اس کی ”چھٹی“ کی رات چلا گیا پھر جو نہ رسم شروع ہوئی میرے من میں جانے کیا سہلی میں نے بھی عورتوں کی طرح کلائی میں دھاگا بندھ اور پہلی بار میرن مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ مجھے

فہمی ہوئی کہ میں جا کر اس کے گلے لگ گیا۔ میں نے سارے مبارکبادی تو کہنے لگا۔

”خیر مبارک! چچا! تجھے بھی مبارک ہو۔“ پھر وہ ہلک ہو گیا۔ اب میں اس سے کوئی بات کرنا تو وہ مجھ سے بات بھی کر لیتا۔

مگر اچانک اس کی زندگی میں وہ دیران رات آئی تھی کہ جس نے اس کے جیسے جیسے گھر کو اجاڑ دیا تھا۔

جیل جانے کے بعد ایک سال تک وہ پھر مجھ سے کھارہا۔ میں اس سے ملاقات کرنے جاتا تو مجھ سے بات کرنے سے بھی گریزاں رہتا مگر آخری چند سالوں میں جب بھی ملاقات پر جاتا وہ مجھ سے اچھے انداز میں بات کرنا اور جب اس کے قید کے سات سال مکمل ہونے کو تھے تو ہم ہر ایک اور مصیبت آگئی۔ ہاں میری باری بیٹی عائشہ پر ”کاری“ کا الزام آگیا۔

یہ بات اعجاز باہر سے سن کر گھر آیا تو گھر میں بیوی کی زبانی بھی سنا۔ اس نے کھماڑی تھام لی اور عائشہ سے کہا۔

”مجھے سچ بتاؤ۔“ تب ہی شیر آگیا۔ اعجاز کو سخت مت کہہ کر عائشہ کو اپنے گھر لے گیا۔ پیچھے اعجاز بھی سے لڑ کر بے غیرتی کے طعنے دے کر اپنی بیوی کے ماتھے سرال چلا گیا۔ میں آخر کیسے اپنی بیٹی کو ”کاری“ کر کے مارتا۔ مجھے یقین تھا میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔

گمبات میں نے اپنی بیوی سے کہی تھی۔ ”اعجاز کے ابا! اپنا کیا بھول گیا کیا۔ جیسی کرنی دہی لہا۔ اس دنیا کا دستور ہے۔ مجھے پتا ہے عائشہ بے گناہ ہے اس کا گناہ صرف یہ ہے کہ وہ تیری بیٹی ہے۔“ میں بہت سے اس عورت کا طرفہ دکھاتا رہا۔

میرا استغفار بڑھتا گیا اور دعائیں بسی ہوتی گئیں۔ برادری کا زور بڑھتا گیا اور آخر دھیرے نے جرگے کا حتمی تاریخ مقرر کر دی۔ وہی دن میرن کی ربائی کا لہا اس کی ربائی کی خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ ہم اسے لینے لگے جاسکے تھے۔

دوسری رات ہم نے آنکھوں میں کلائی۔ مسجد سے میاں لگ کر میں رات کے ایک بجے گھر آیا تھا۔

میری تینوں بیٹیاں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کی ماں چاہیائی پر بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں دعا مانگی۔

”یا اللہ! میری اس رات کی نیکی اگر تیری بارگاہ میں مقبول ہے تو اس نیکی کے صدقے عائشہ کی زندگی دے دے۔“ آمین کہتے ہوئے میں دلی جان سے لرز گیا تھا۔

”عائشہ! بیٹا! نفل پڑھ رہی ہو؟“

”نہیں بیٹا! کچھ نمازیں رہ گئی ہیں۔ قضا پڑھ رہی ہوں۔“ بڑے سکون سے اس نے جواب دیا تھا۔

کوئی اپنی موت کی تیاری یوں بھی کرتا ہے جیسے عائشہ۔

”یا اللہ! یہ بیٹی میری کس نیکی کے صدقے میں دی ہے۔ اے میرے گناہوں کی پاداش میں نہ چھین۔“ آنسو آنکھوں میں آکر التجا بن گئے تھے۔ جسم کا رواں رواں دعا بن گیا تھا۔

اس کمرے میں پانچوں نفوس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں اور دلی کی ہر دھڑکن محسوس تھی۔ جس وقت جرگے میں فیصلہ سنایا جاتا تھا اسی وقت میرن آگیا تھا۔ وہ مجھے گلے سے لگائے کتنی ہی دیر میری ہمت بندھاتا رہا۔ اس کی ڈھارس نے میری توانائی میں کتنا اضافہ کیا تھا اور پھر جب عائشہ کے ”کاری“ ہونے کا فیصلہ ہو گیا تو وہ اس کا نجات دہندہ بن کر اٹھا تھا۔ اس کے فیصلے پر سارے جرگے کو سناں ہو گیا تھا۔ اس کے اس فیصلے نے صرف عائشہ کو ہی نہیں ہم سب کو بھی نئی زندگی دے دی تھی اور لوگوں کو تو صرف باتیں بتانا آتی ہیں۔ ایک جانب اسے غیرت مند کہتے تو دوسری جانب قابل اور اب اسے شاید بے غیرت کا اعزاز بھی ملنے والا ہے۔

میرن نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ احسان اس کی ساری نفرت پر بھاری ہے۔ وہ خود کون سا خوش رہا ہے اس لیے کہ نفرت کا شکار ہونے والا اور کرنے والا دونوں ہی کبھی بھی آسودگی نہیں دیکھتے۔ دونوں عجیب سے احساس میں جلتے رہتے ہیں۔

اب وہ نئی زندگی گزارے گا۔ وہ شہر ذات کے

کھنڈروں پر ایک نیا شہر آباد کرنے والا ہے، جہاں وہ آسودہ زندگی بسر کرے گا۔ اللہ اسے اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ مجھے اپنے اللہ پر پورا یقین ہے۔

گر یہ یعقوب ہو تو یوسف چاہ سے باسلامت نکل سکتا ہے۔

ایمان کی قوت ہو تو آگ بھی گلزار بن جاتی ہے۔ خدا پر کامل یقین ہو تو طوفان نوح بھی جھوپڑی میں بیٹھی بوڑھی عورت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

موت جو اپنے پر پھیلانے اس کی طرف برہہ رہی تھی کہ اس کی راہ میں دعا اور نیکی آگئی۔ زندگی جو ہر اسلہ ہو کر اس سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی آگے برہہ کر ایک بار پھر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

میرن ایسی آگ کا نام جو بجھی ہوئی چنگاری سے بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ محبت پر بھی غصے کا بھانجھڑ بن جاتا۔ شعور سنبھالتے ہی میں نے اوی وڈی۔ اوی سلیمہ اور بھائی اعجاز کو اس سے خار کھاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی بھی اس سے خوش نہیں رہے۔ ابا کو ہمیشہ خاموش اور اماں کو اس کی حمایت پایا۔

جہاں ہے کہ اماں کے سامنے کوئی اس کو برا کہہ دے۔ البتہ جب وہ تینوں اکٹھے بیٹھتے تو خوب اس کی برائیاں ہوتیں۔ اس کی بد تمیزوں کا تذکرہ ہوتا۔ اسے گالیوں سے نوازا جاتا۔ نمک حرام، بلا لائق اور پتا نہیں کیا کیا لقب ملتے رہتے۔ میں چپکے چپکے وہ باتیں سنتی اور جھٹلاتی رہتی۔

”بھامیرن ایسا نہیں ہے۔“
مجھے یاد ہے، جب میں چھوٹی سی تھی۔ اماں نے مجھے لوٹے میں لٹی دے کر کہا۔ ”بھامیرن کو دے آ۔“
جیسے ہی میں صحن میں پہنچی بھوکے کونے مجھ پر جھپٹے۔
لوٹا میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں ڈر کے مارے چیخ مچا کر رونے لگی۔ برآمدے میں بیٹھا ہوا میرن دوڑ کر آیا اور مجھے گود میں اٹھا کر واپس لوٹا۔ تب تک کوئے اس کی روٹی لے اڑے تھے۔

”دیکھ چاچی، لٹی بھی میری گئی۔ روٹی بھی میری اور رو عاتشہ رہی ہے۔ حالانکہ روٹا تو مجھے چاہیے۔ وہ منہ سورنے لگا اور میں روتے روتے ہنس پڑی۔“

اس دن کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ بھامیرن سب جانتے ہیں۔

پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اب وہ ہمارے گھر نہیں تھا۔ اب جب میں اس کے گھر جاتی وہ مجھے میرن مہمان کہہ کر پھینٹا رہتا۔ تو میں شرما کر لوی وڈی۔ کمرے میں چل جاتی۔

کچھ عرصہ اور گزر رہا تھا میں اچھی خاصی سمجھ دار بن چکی تھی۔ جب علی کی چھٹی کی رات میں نے میرن کو دیکھا کہ اب اسے گلے ملنے دیکھا تو میرن یقین پختہ ہو گیا کہ واقعی سب جھوٹ بولتے ہیں۔ چاچی مریم مجھے بہت ہمت دیتی تھی۔ میں اسے سختی دیتی تھی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتی تو ہنس کر مجھے بچھڑکتی تھی۔ میں جھینپ جاتی۔ اماں کہتی۔ ”مریم! میری عاتشہ تو تجھے پر عاشق ہو گئی۔“

اب میں جب بھی اوی وڈی کے گھر جاتی تو وہ مجھے مہمان اور اماں کی عاشق کہہ کر پھینٹا رہتا۔ میں جلدی سے علی کو اٹھاتی۔ رضا کو انگلی سے پکڑ کر جو چلتی تو لہو لیتی۔ ان سب کے قہقہے میرا پیچھا کرتے۔ کوئی بھڑک کوئی ڈانٹ یا غصہ میرے حصے میں کچھ نہیں پڑتا۔ سنی سنائی باتوں پر کیسے یقین کر لیتی۔

یوں میں کبھی بھی میرن سے نفرت نہ کر سکی۔ بلکہ اس کی محبت میں روز بروز اضافہ ہو گیا۔

جب بھی وہ کھانا کھا رہا ہوتا اور میں موجود ہوتی تھی مجھے ضرور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھانا۔ ”نہج نہج کر کہتی۔“

”چچا کی اولاد میں تجھے بس یہی اچھی لگتی ہے۔“
وہ ہنس دیتا۔

اک عجیب شور سے میری آنکھ کھلی تھی۔ کوئی روٹا تو کوئی چیخ رہا تھا۔ میں نے ہڑبکا کر آنکھیں رگڑتے۔ چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ ابھی فجر کا وقت تھا۔

لوی سلیمہ کو باند سے پکڑ کر پوچھا۔
”اوی! کیا ہو گیا ہے؟“

”میرن نے مجھ کو کاری کر دیا ہے۔“ اس نے سر راتی آواز میں کہا۔

بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ تب ہی میں اماں کے پیچھے پیچھے میرن کے گھر آ گئی۔ پتا نہیں ہماری خوشیوں کو کس کی نظر نکل گئی۔ ہمارا ہنستا ہوا گھر اجڑ گیا۔

چاچی اماں سے لپٹ کر رہی تھی۔ کچھ محلے کی عورتوں نے برآمدے سے چارپائیاں باہر نکل کر رلیاں بجا دیں۔ میں اب بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کاری کس بلا کا نام ہے۔ میری نظریں میرن اور مجھ کو تیزی سے دھونڈ رہی تھیں۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ ادا شیر راجا زور سے مڑوں کے ساتھ اک چارپائی اٹھا کر رہے ہیں۔ روٹے میں یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ سب لوگ دور سے تھے۔ میں نے گھبرا کر چارپائی پر اجرک میں لپٹے وجود کو دیکھا۔ لاش۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

کسی نے اجرک منہ سے ہٹائی تھی۔ کھڑی ہوئی روٹوں کے بیچ میں سے جبکہ ہاتھ میں آگے آئی تھی۔ پھٹا ہوا سر آدھ کھلی آنکھیں۔ خون میں تر ہو چکا۔ کچھ کر میرے روٹے کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اجرک خون سے لال ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو رنگ کر کے پٹیاں باندھی جا رہی تھیں۔ میں یہ سب دیکھ کر کھانا نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر دیکھ رہی تھی۔

پھر میں سمجھنے ہوئے علی اور سارہ کو لے کر گھر آ گئی۔ کھانا کھریں آکر میرا خوف اور بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر اوطاق میں جا کر مڑوں کے پاس بیٹھ جاؤں۔ وہاں لاش تو نہیں ہوگی۔ مگر اماں کہتی تھی۔

”اب تو بڑی ہو گئی ہے لور لور نہ پھر۔“
میں گلی میں کھڑی ہو گئی۔ تب ہی راجہ نے سر باہر کر مجھ کو کھلا۔

”باہر کیوں کھڑی ہے اندر آ جاؤ۔“
”میں سمجھی تم سب لوگ اوی وڈی کے گھر“

”نہیں اماں گئی ہے۔ ہم گھر میں ہیں۔ مجھے تو سن کر ڈر لگ رہا ہے۔ تو بھی کیوں گئی تھی؟“

”مجھے پتا نہیں تھا۔“
”تو بیٹھ ہمیں روٹی لاتی ہوں۔“

لوالہ میرے گلے میں انگ بٹھا تھا۔ علی اور سارہ کو کھلا کر میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”تو بھی تو کھا۔“ راجہ نے کہا۔

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ تب ہی راجہ کے ابا نے آکر پستول اٹھایا۔

”ایسا کیا ہوا؟“ راجہ کی بڑی سن نے پوچھا۔

”دھڑی! یاد کے بھائی بدلہ لینے کے لیے آ رہے ہیں۔“ وہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ ہمارے خوف میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ہم ڈر کر اوی کے گھر آ گئے۔

نہجہ کے رشتے دار آ گئے تھے۔ انہوں نے جوں ہی بچوں کو دیکھا۔ تو انہیں پٹا کر اور زیادہ روٹے لگے۔ آہستہ آہستہ میرا چہرہ بھی جھپٹتا جا رہا تھا۔ بہت بڑے نقصان سے بے خبر بچے سب کو روٹے ہوئے دیکھ کر خود بھی رو رہے تھے۔

اس وقت پہلی بار میں نے میرن سے نفرت محسوس کی تھی۔

میں بار بار لاش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے جا کر برآمدے کے ایک کونے میں صحن کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ مگر سرگوشیاں میرے ذہن کو سن کر رہی تھیں۔

”بھلا کوئی مرد اس حالت میں اپنی عورت کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔“

”ہاں مگر پہلے تو نہجہ بھی ایسی نہیں تھی۔“
”بیچ کہتی ہو پر انسان کو بھڑتے کون سی دیر لگتی ہے۔“

”بیچارہ میرن۔ گھر ہی اجڑ گیا۔ چرچہ۔“
”اس نے خود اجاڑا ہے؟“

”ہاں تو کیا کرتا؟ بے غیرت بن جاتا۔“ میں خاموشی سے ان کو دیکھتی رہی۔ کہیں رحم تھا تو کہیں نفرت۔

تب ہی پولیس والے آگئے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو گا۔ پھر سب کام آٹاٹاٹا ہو گیا۔
رات کو پتہ چلا میرا نے خود گرفتاری دے دی ہے۔ وہ ساری رات میں لال سے لپٹ کر جاگتی رہی۔
میری خیز شاید ان آدھ کھلی آنکھوں میں کہیں کھو گئی تھی۔



”لوگوں کی باتوں کو دل پر نہ لو۔ ان کا کام تو باتیں بنانا ہی ہے۔“

میں لڑکر سیدھی چچی کے پاس آئی تھی۔ وہ بڑوس کے بچے تھے جنہوں نے علی کو ”چل رے چل کاری کے بیٹے“ کہا تھا۔ وہ روتے ہوئے میرے پاس آیا تو میں نے جا کر ان بچوں میں سے جو بھی ہاتھ آیا۔ ان کو ایک ایک ہاتھ لگا دیا۔ پھر جوان کی ماؤں نے جھگڑا برپا کیا تو مجھے چاچی کے گھر ہی پناہ لینی پڑی۔ اب چاچی مجھے سمجھا رہی تھی کہ میں ان سے نہ جھگڑوں۔

”مگر میں کیا کروں۔ ان کے طنز مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ خود ہی تو بچوں کو سکھا کر بھیجتی ہیں۔ چلو ایک بار کہا ہو تو جانے دو مگر تو بار بار کہتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے چاچی سارا قصور ان کی ماؤں کا ہے۔“

”جب پتہ ہے کہ قصور بڑوں کا ہے۔ تو کیوں جھگڑتی ہے۔ دیکھ میری! اسے تو ہی سمجھا۔ آخر میں کتنے جھگڑے پنڈاؤں کی۔ جب دیکھو کسی نہ کسی سے لڑکر چلی آتی ہے۔“ اہل جوان سے نبٹ کر آئی تھی چچی سے کہنے لگی۔

مجھے پتہ تھا کہ اب وہ دونوں دکھ بانٹتی رہیں گی۔ میں وہاں سے اٹھ کر ادنی وڈی کے پاس آگئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے نجمہ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ کیا تھا اگر وہ نفس کے گھوڑے کو لگام دیے رہتی تو اس کے بچے اس ذہنی اذیت بچے رہتے۔



اس دن کام نبھا کر میں ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ رابعہ آگئی۔

”عائشہ! جلدی آلائیں دوسرے گاؤں گئی ہیں۔ تک آجائے گی۔ تب تک میں تمہیں مونی بنا دوں۔“ وہ پچھلے ہی دنوں یہ ٹانگا دوسرے گاؤں کسی رشتہ دار سے سیکھ کر آئی تھی۔ اب سب سے ہوئی جارہی تھی مجھے سکھانے کے لیے۔

”جلدی کر۔ بڑا مشکل ٹانگا ہے، دیر گئے گی سین میں۔“
”تمہیں پتہ ہے میرے لیے کوئی کام مشکل نہیں بلکہ تو ایسا کر مجھے نہیں سکھا دے۔“
”ہاں چچے گھر میں کوئی نہیں اگر کوئی چیز ادھر لے آؤ۔“
”ہاں تو سمجھو اماں کی جوتیاں پڑیں کہ پڑیں۔“
”ہاں تو ڈر کیوں رہی ہے۔ یہ تو روز کا معمول ہے۔“ میں نے اسے چھیڑا۔

”دیکو اس ہی کرتی رہ۔ میں تو جارہی ہوں۔“
میں نے اجازت لینے کے لیے اہل کی طرف دیکھا۔ ہماری ٹوک جھونک پر وہ خس رہی تھی۔ ز نے اہل میں سر ہلادیا۔ میں فوراً اس کے پیچھے چکی۔ ہماری باتیں جو شروع ہو میں تو ختم ہونے لگا۔ ہی نہیں لے رہی تھیں۔ آخر کو اتنے دنوں کی جمع کی ہوئی تھیں۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔

”ماسی نور! نے تو ادی کے بھی ایسے کلن بھر ہیں کہ وہ کہتی ہے کہ میرے رضا کے لیے کاری کی بی بی رہ گئی ہے کیا اور بھاشیر کتا ہے کہ جیسے ہی بھامین آزاد ہو گا میں سارہ اور رضا کی منگنی کروں گا۔ کل بھی ان میں جھگڑا ہوا ہے بھامین کی آزادی میں تین ماہ گئے ہیں۔ پتہ نہیں تین ماہ بعد کیا ہو گا۔ مجھے تو ابھی سے ہول اٹھ رہے ہیں۔“

”ارے بھئی! ہولتی کیوں ہے اللہ بستر کرے گا۔“
”ارے اتنی دیر ہو گئی۔ اب تو ماسی کے آنے کا نام بھی ہو گیا۔ چل پکڑ فریم میں تو چلی۔“ میں نے جلدی سے چپل پہنی اور باہر آئی۔

رابعہ کے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر ہمارا گھر تھا۔ میں جوں ہی دروازے پر پہنچی تو دیکھا کہ اک لڑکا دروازے میں کھڑا ہے بالکل جم کے۔ اندر جانے کا راستہ بند۔

میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ اب اس سے کیسے کہوں کہ وہ بچے تو میں اندر جاؤں۔
 ”اوا! ذرا ہنٹا۔“ میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔
 اس کی میری طرف پیٹھ تھی۔ میری اچانک آواز پر وہ ایک دم اچھلا تھا اور جلدی میں مجھے راستہ دینے کی کوشش میں نیچے بڑی ہوئی اینٹ سے ٹکرا کر زمین پر پوس تھا۔ بلو جود روکنے کے میری ہنسی نکل گئی۔ ہنسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور وہ نجل نجل سا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔
 ”جیسی میری نظریاں پر پڑی۔ وہ بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری ہنسی کو بریک لگ گیا اور فوراً گھر میں گھس گئی۔
 پتا نہیں کون تھا۔ شاید بھابھا اعجاز سے کوئی کام ہو گا مگر ماسی نور ایں کی گندی نظروں کو سوچتے ہوئے میں کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ غیرت کے شمشان میں موت کی آہ تھی پر کاری کی چٹا کو زندہ جلانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

اس دن میں بھابھی کے ساتھ ادی وڈی کے گھر سے آ رہی تھی کہ راستے میں وہی نوجوان کھڑا دیکھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اس دن والی بات یاد آگئی۔ بمشکل میں نے مسکراہٹ کو چھپایا۔
 ”یہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ بھابھی نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ کر اس نوجوان کو دیکھا۔“
 ”رضا! یہ ادی کون ہے۔“ میں نے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے رضا سے پوچھا۔
 ”کیوں؟ نہیں جانتی ہو گیا؟“ رضا کے بجائے بھابھی نے کہا۔
 ”نہیں مجھے کیا پتہ۔“
 ”جھاوا واقعی تمہیں نہیں پتہ۔“ اب کے لہن کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
 ”نہیں بھابھی! تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ اس دن دیکھا تھا راجہ کے گھر سے واپسی پر۔ سوچا کسی سے

کام ہو گا تبھی آیا ہے۔“
 ”ہاں وہ چچا خیر نہیں تھا۔ جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے سارے کاہنا ہے۔ کراچی سے آیا ہے۔“
 اب کے اس نے لہجہ نارمل بنانے کی ناکام کوشش کی۔
 ”ہاں میں بھی کہوں پہلے تو یہ چٹو نیا نہیں دیکھا۔“
 مجھے اپنے ہی دے ہوئے لقب پر خود ہی ہنسی آگئی۔
 ”ہاں چٹو نیا بے جا رہا! آیا ہے گھوٹے پھرنے دل لگانے کے لیے۔“ آخری جملہ گو کہ اس نے آہستگی سے کہا مگر میں سن چکی تھی اور اب اس کے لہجے پر غور کر رہی تھی۔ کچھ نہ سمجھنے پر اس خیال کو جھٹک کر میں کام میں لگ گئی۔
 ”عائشہ سویرے ہی کام میں لگ گئی ہو؟“ ادی سلیمہ نے پوچھا۔
 ”ہاں ادی! چاول، چڑھا دوں۔ دوسرے کام ڈرامہ دیکھ کر روئی گی۔“ کچھ عرصہ پہلے ہی ہمارے گاؤں میں لائٹ آئی تھی۔ اب سندھی ڈرامہ ہم سب شوق سے دیکھتے تھے۔
 ”ارے ہاں آج تو آچر (اتوار) ہے میں تو بھول ہی گئی تھی۔“
 اور اب ڈرامہ کب کا ختم ہو چکا تھا مگر ہمارا افسوس کم نہیں ہو رہا تھا۔
 ”ادی! کتنی بے دردی سے اس نے (ہیرو نے) اپنی بہن کو مار دیا۔“
 ”ہاں بھی غیرت مندوں کے کام ہیں یہ۔“
 ”اس میں غیرت مندی کی کیا بات ہے؟“
 ”ہاں تم تو کہو گی آخر۔ پر اعجاز بھی ایسا ہی غیرت مند ہے۔“
 ”تم نے دیکھا نہیں وہ بے چاری بے گناہ تھی اور یہ اعجاز کی غیرت سچ میں کہاں آگئی؟“ میں حیران رہ گئی تھی۔
 ”میں دیکھ رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے تم عائشہ پر زیادہ ہی طنز کر رہی ہو۔“ ادی سلیمہ نے میرا دفاع کیا۔
 ”میں میں کیوں کرنے لگی طنز۔ سچ کہتی ہوں، کڑوا لگے تو لگتا رہے۔“ بھابھی نے تنک کر کہا۔

”کیا ہے سچ۔ ہاں بول کیسا سچ؟“

”دیکھ سلیمہ! غصہ کیوں ہو رہی ہے۔ سارے گاؤں میں ڈھنڈورا ہے کہ عائشہ اس شہری کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔“
 ”کون کہتا ہے۔ جو کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔“
 ہماری عائشہ ایسی نہیں ہے۔“ ادی سلیمہ نے غصے سے کہا۔
 ”ارے ماسی اور اس کے شوہر نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے، کہ وہ نوجوان نیچے گرا ہوا تھا اور توبہ توبہ۔“ اس نے اپنے دونوں گل پیٹھ ڈالے۔
 ”میں کہتی ہوں منہ سنبھال کر بات کر۔“
 ”کیا یہ صحیح ہے عائشہ؟“ بھابھا کی دھاڑ پر ادی سلیمہ کی بات سنی ہی میں رہ گئی۔
 اور میری حالت تو سکرات والی ہو گئی تھی۔ اتنا بڑا الزام اور وہ بھی بے گناہی پر۔ بھابھی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ بھابھا اعجاز سے پستول ماں نے آکر چھینا اور کلھاڑی ادا شیر نے آکر لی تھی۔
 ”ہائے ہائے مجھے کیا پتہ تھا کہ تو دروازے میں کھڑا ہے۔ ورنہ تو میں یہ بات ہی زبان پر نہ لاتی تو کیوں اپنی جوانی برباد کرنے پر تیار ہوا ہے۔ اندھوں اور بہروں کی بستی میں ہمارا کیا کام۔ چلو یہاں سے۔“ بھابھی پہلے سے تیار شدہ پٹی اٹھا کر بھابھا اعجاز سے کہنے لگی۔ مگر اس سے پہلے ادا شیر مجھ کو اپنے گھر لے آیا۔ سارے محلے والوں کے سر باہر نکلے ہوئے تھے۔ حیرت، افسوس، نفرت کیا کچھ نہیں تھا ان نگاہوں میں جو تیر بن کر میرے وجود میں چبھ رہی تھیں۔ ان ہی میں ایک چہرہ ایسا تھا جس پر فتح کی چمک تھی اور میں واقعی آج ہار گئی تھی۔ ساسی نور ایں سے۔

پھر آتا ”فانا“ سارے مرحلے طے ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کے اصرار پر وڈرے نے جرگہ بلا لیا۔ وہ نوجوان تو اس دن ہی واپس چلا گیا۔ اب صرف میرا فیصلہ ہونا تھا۔ میں دن بہ دن موت سے قریب ہو رہی تھی۔ بھابھی

اور بھابھی کے علاوہ سب گھر والوں نے اس الزام پر یقین نہیں کیا تھا۔ یہ اعتماد مجھے ڈھارس بندھاتا۔ کم از کم میں اپنی نظروں میں تو کاری نہیں ہوں۔ موت کا دکھ کم ہونے لگا۔ رضاعی اور سارہ ہر وقت میرے پاس ہوتے۔ میرا دکھ کم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ مجھے حیرت ہوتی ان بچوں پر جو میرے لیے ہر ایک سے لڑ پڑتے۔ ہر صورت میرا دفاع کرتے اور مجھے بچانا چاہتے تھے اور بھر وہ دن بھی آپہنچا۔ جس دن خوشی اور غمی کا ملاپ ہونے والا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ موت کو پانے والے کو زندگی اور زندگی والی کو موت دی جا رہی تھی۔
 میرا یہ میری نفرت کم ضرور ہوئی تھی مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر فی الحال میرا ذہن ہر احساس سے عاری تھا۔ احساس تھا تو اپنی بے گناہی و بے بسی کا۔ اس ماتم زدہ دن کل سورج لال میں گہرا غروب ہو گیا۔ تب ہی اندھوں کی آواز سنی تھی۔ مجھے لگا یہ موت کی چاپ ہے۔ مگر آنے والا رضا تھا۔ جواب مجھ سے چٹا زارو قطار رو رہا تھا۔
 ”ہاں یہ میری موت کے فیصلے پر رو رہا ہے۔“ میں نے دکھ سے سوچا تھا کہ اچانک علی ہنستا ہوا آیا۔
 ”یہ علی کیوں ہنس رہا ہے۔ اسے بھی میری موت کی خوشی ہے کیا؟“ وہ سیدھا مال کے پاس آیا۔
 ”مال وڈی! مبارک ہو۔ عائشہ سچ کہتی ہے۔“
 ”یہ کیا کہہ رہا ہے۔“ میں نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھ کر رضا کو دیکھا۔ مگر وہاں بھی مسکراہٹ تھی اور اقرار میں ہلتا ہوا سر۔ وہ رو بھی رہا تھا اور ہنس بھی رہا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا ”ابا ہنستے ہوئے آ رہے ہیں۔ اب میں بے یقینی کے گرداب سے نکل کر یقین کے کنارے پر کھڑی تھی۔
 کیا موت کے شکاری زندگی کے پیامبر بھی بن سکتے ہیں۔ شاید شاید رہزن راہبروں ہی بنتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ جب لیرا ہی محافظ بن جائے تو سفر خیریت سے کٹ جاتا ہے۔ میرے لیے بھی لیرا ہی محافظ بن گیا تھا۔

میرن کے ایک عمل نے مجھے جہاں اس سے نفرت کھائی دو سرے ہی عمل نے وہ نفرت ختم بھی کر دی۔ پہلی بار وہ زندگی چھیننے کا وسیلہ بنا اور دوسری بار زندگی بچانے کا اس نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جس گناہ کے الزام پر اس نے اپنا گھر اجاڑ دیا۔ وہی ہی الزام زندہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ میں معصوم تھی۔ بے گناہ تھی تو اپنیوں کی نظروں میں۔ مگر اس کی نظروں میں تو کاری تھی۔ جرگے میں یہ الزام جھوٹی گواہیوں سے ثابت ہو چکا تھا۔ اسے تو حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے تو ایک کاری کو ہی قبول کیا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ ادنیٰ دوی نے رضا کے لیے بار بار سارہ کو روک دیا تھا۔ پھر بھی احسان کر کے اس کی بہن کی زندگی بچائی تھی۔ تو یہ اس کا اعلا حسن سلوک تھا۔ تو کیا وہ اب بھی قاتل نفرت ہی رہے گا۔ نہیں قطعاً نہیں۔

اس کی نیکی نے نفرت کو اس کی زندگی کے اکھاڑے سے باہر پھینک دیا تھا۔ اب وہ فلاح محبت سراسر ہے۔



سینٹ سے بنا ہوا صحن کا فرش ابھی ابھی دھویا گیا تھا کہ صحن ٹھنڈا ہو جائے تو اس پر چارپائیاں بچھا دی جائیں۔ صحن کے بائیں طرف لگے ہوئے آم کے بیڑے بیچ میں گلاب کے پودے۔ پودوں کے دوسری جانب گجور کے لمبے لمبے درخت عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ چار کمروں کے آگے لمبے سے برآمدے میں بالا کا بنا ہوا لال ہندو رو (سرخ جھولا) جھولے میں سویا ہوا ایک سالہ امید علی جواب اٹھ کر منہ بسور رہا تھا۔ دو بوڑھے ہاتھوں نے اسے ابھی اٹھایا ہی تھا کہ علی دوڑتا ہوا آیا۔ "دادی ایاں! مجھے دو۔" دادی ابھی اس کی غجالت پر ہنس ہی رہی تھی کہ سارہ آگئی۔

"دادی ایاں! نہیں پہلے مجھے دو۔" تب ہی علی نے جھپٹ کر دادی کے ہاتھوں سے ننھے وجود کو لیا۔ اب ننھا چار ہاتھوں میں اور کھینچا تانی شروع۔ "بھیا! امید مجھے دو۔" کہہ اچانک پیچھے سے لمبو ترے

رضانے ان دونوں سے ننھے امید کو اچک لیا۔ اب اس کو دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھائے ان کی پیٹھ سے دور بھاگ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے علی اور سارہ۔ مقبول کی جھنکار چار سو بکھری تھی۔

صحن میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے مود نے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا جو برآمدے سے چارپائیاں کھینٹ کر صحن میں بچھاری تھی۔ بیوی کی نظریں جوں ہی شوہر سے ملیں تو اس کے مسکراتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

ہم بندے بھی کتنے ناشکرے ہیں۔ تھوڑی سی تکلیف کا سامنا ہو تو اللہ سے شکوے کی عبا جلد پس لیتے ہیں اور ڈھیر ساری نعمتوں پر شکر کی چوٹی بھی نہیں پہنتے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ بائیس سالہ زندگی میں کبھی اللہ کا صحیح شکر نہیں کیا۔ مگر جب کاری شہرانی گئی۔ تو اللہ کو انصاف یاد دلانے لگی۔ کتنے کم ظرف ہیں ہم بندے اپنی غجالت میں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ جب مصف ہے تو انصاف کیونکر نہ کرے گا۔ مگر ہم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔ جلد بازی میں چاہتے ہیں کہ جس جو ہم چاہیں وہ فوراً ہو جائے۔ اللہ کو بھی اپنی مرضی پر چلانا چاہتے ہیں۔ استغفر اللہ خود اس کی مرضی پر نہیں چلتے۔ خدا کو تو خدائی یاد دلانے لگتے ہیں اور خود عبادت کو بھول جاتے ہیں کہ ہم بندے ہیں۔ ہمیں اللہ کی رضا پر راضی رہنا ہے تاکہ اللہ بھی ہم سے راضی ہو کر ہمیں وہ دے دے جو کہ ہم چاہتے ہیں۔ وہ لمحہ جب میں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کیا تھا۔

"کہہ مولا تو جو میرے لیے بہتر چاہے وہ کروے۔" وہ لمحہ میرے لیے حاصل زیست ہے کہ جب اللہ نے رحم کر کے میری موت کو زندگی میں بدل دیا پھر ٹھیک ایک سال بعد میری گود میں امید علی کو ڈال دیا۔ امید علی جو ہم سب کی امید ہے۔ اللہ نے ایک کرم یہ بھی کیا کہ میرن کے قلب کو بدل دیا۔ اسے اچھا انسان بنا دیا۔ بھٹکتا بھٹکتا بالآخر سیدھی راہ پر آئی گیا اور یہ سب اللہ کا کرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ

اے اللہ ہمیں شکر ادا کرنے والا بنا اور وہ شکر اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔



یوں عائشہ میری زندگی کا حصہ بن گئی۔ کہنے کو تو میں کہہ بٹھا کہ اس وقت میرے اندر کے انسان نے مجھ سے یہ نیکی کروالی تھی۔ مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ وہ تو مجھ سے چند رہ برس چھوٹی ہے۔

ایک تو کم عمر دوسرا ایک قاتل کا ساتھ بھیا بھی سکے گی یا نہیں اور کیا پتہ اس نے واقعی اس لڑکے سے محبت کی ہو۔ میرے اندر کے اتار پرست مرد نے مجھے درغلایا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ نیکی اک بار پھر جیت گئی تھی۔ اس لیے کہ اس نیکی میں بھی میری خود غرضی شامل تھی۔ میں نے سوچا میں یہ نیکی کروں تو ہو سکتا ہے کہ میرے گناہوں کی چھاپ میری سارہ پر نہ پڑے۔ اللہ اس نیکی کے عوض سارہ کا مقدر اچھا کر دے۔ ہم بندے اپنی غرض کے سوا کچھ بھی نہیں کرتے اور لوگ سمجھتے رہے کہ میں نے بہت بڑا ثواب کمایا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس نیکی پر مجھے واقعی خوشی ہونے لگی۔ سارہ والا مفلا کہیں دور جا سوا۔ اس لیے کہ عائشہ نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا اور پتہ نہیں کیوں میں اس کے سچ کو جھٹلا نہیں پایا۔ اس کا چہرہ سچ سچ کرتا رہا تھا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے وہ واقعی بے گناہ ہے۔ پھر اس کی بچوں کے ساتھ شفقت نے اس کی معصومیت پر میرا ایمان پختہ کر دیا۔ میں غیر محسوس انداز میں اس سے محبت کرنے لگا۔ بے تحاشا اگر کوئی کہہ دے کہ عائشہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ میری سانس رک جائے گی۔ اس لیے کہ اس نے مجھے گھر کا سکھ دیا۔ میرے بچوں میں احساس کتری پیدا نہیں ہونے دیا۔ انہیں ماں کا پیار دیا۔ ان کے لیے سب سے لڑی۔ اس کے اندر بہت ساری اچھائیاں تھیں۔

پھر ایک بات ایسی ہوئی کہ جس نے مجھے لرزایا۔ اس دن میں گھر میں داخل ہوا تو عائشہ کی آواز میرے

کانوں میں پڑی۔ "دادی سلیمہ! جب ہمیں پتہ تھا کہ اس کے قدم غلط راہوں پر ہیں۔ تو تمہیں اسے روکنا چاہیے تھا۔" "اللہ گواہ ہے عائشہ کہ میں نے اسے نہیں درغلایا تھا۔ وہ پتا نہیں کیسے بھٹک گئی تھی۔ پہلے البتہ میں نے اسے روکا نہیں۔ میرے اندر کے کمین بن نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس لیے کہ میں نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گر جائے گی اور مجھے علم ہوا کہ میرن اسے مار دے گا تو میں ضرور اسے روکتی۔"

"ایک گھر میں رہتے ہوئے مجھے علم نہیں تھا تو تمہیں کیسے پتہ لگا۔" یہ دھیمی آواز بھر جالی کی تھی۔ مجھے لگا میرے اندر وہ پہلے والا میرن آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے۔ "نجمہ نے مجھے خود بتایا تھا۔"

"پر اسے روکنا تیرا فرض بنتا تھا۔ برائی سے نہ روکنے والا بھی ایک طرح سے برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔"

"ہاں عائشہ! تم صحیح کہتی ہو۔ احساس تو پہلے بھی تھا۔ پر تم پہ لگے الزام کے بعد میں نے کتنے توبہ و استغفار کیے ہیں۔ پھر جب میرن نے تجھ سے شادی کی تو مجھے لگا میری توبہ قبول ہو گئی ہے۔"

تب ہی پہلے والے میرن نے بیدار ہو کر دروازے پر ٹھوکر ماری۔ ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تینوں بہنوں کے چہرے قہقہے ہو گئے۔

میں ان پر ایک عصبیلی نظر ڈال کر کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر کے بعد عائشہ مجرموں کی طرح سر جھکائے میرے پیچھے چلی آئی۔

میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی محبت مجھے کمزور کر دیتی جو کہتے ہیں محبت بہادر بنا دیتی ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عائشہ کے لیے کوئی غلط فیصلہ کروں۔ ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ اگر وہ یکدم میرے سامنے نہ آئی۔

تب ہی پہلے والے میرن نے میری پیٹھ تھپکی۔ میں

جولینا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”عائشہ! دھر آؤ۔“ مجھے اپنی ہی آواز جیسی لگی۔
وہ خاموشی سے سر جھکائے چنگ کی پائنتی پر ٹپک

گئی۔
”دیکھ! اگر تو مجھ سے سچی محبت کرتی ہے تو مجھے سچ سچ
بتا۔ سلیمہ کیا کہہ رہی تھی۔“ اس نے نظریں اٹھا کر
مجھے دیکھا۔ جیسے رحم کی ہچکچاہٹ رہی ہو۔ پھر مطمئن
ہو کر مجھے سب کچھ بتا دیا۔

سلیمہ اور نجمہ کی کھسر پھسر میرا اجڑا گھر سات
سال قید قتل قاتل میرے اندر غصے کا بھانجھڑا ہوتا
گیا۔ میں نے اٹھ کر ہماری کھولی اور اس میں پستول
تلاشنے لگا۔

”پستول دراز میں ہے۔“ اس توازن میں نے پلٹ
کر دیکھا اسی وقت اس نے نگاہیں مجھ پر گاڑیں۔ جیسے
رحم کی آخری اپیل کر رہی ہو۔ میں نے اس کے بھرے
بھرے خوب صورت وجود کو دیکھا۔ اس کی محبت
میرے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ میں اس کے
قریب آ گیا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں
پکڑے پستول کو دیکھتی۔ مگر وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے
میرے عکس کو آنکھ میں محفوظ کرنا چاہتی ہو۔ محبت
نے میرے ہاتھوں سے پستول گرادیا۔ جواب اس کے
قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

محبت واقعی بڑا دل بتا دیتی ہے۔ میں باہر نکل آیا۔
اب سب چہلوں پر خوف تھا۔ گیٹ پر مجھے دو ڈکر
آتے شیر اور رضا ملے۔ شاید انہیں بلایا گیا تھا۔ میں ان
کو نظر انداز کر کے باہر چلا گیا۔ اس رات میں گھر نہیں
گیا۔ مسجد میں بیٹھا رہا۔ مجھ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ میں کیا کروں۔

”یا اللہ! تو مجھ پر رحم کر اور رہنمائی فرما۔“ میں نے
گڑبڑا کر رب سے التجا کی۔ پھر برت در برت ہمید کھلتے
گئے۔ اللہ کی رحمت نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ بات
صرف اتنی ہی ہے کہ جب ہم اللہ کے اختیار اپنے ہاتھ
میں لینے کی کوشش کرتے ہیں تو بھٹکتے ہی رہ جاتے
ہیں۔ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ ساری خرابی

میں سے شروع ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہے۔
کہ بدلہ لینے کا اختیار میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
پھر بے سکونی بدنامی کیوں نہ مقدر رہتی میرا۔ اللہ نے
بندوں کو صرف لٹا اختیار دیا کہ جتنا اس کا نقصان ہو۔
آنکھ کے بدلے آنکھ، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، جان کے
بدلے جان بندہ جب صاحب اختیار ہو تو بڑھ چڑھ کے
بدلہ لیتا ہے۔ میں بھی پہلے چچا سے خوب بدلہ لیتا رہا۔
پھر غیرت کے گھنڈ میں اگر مجھ کو قتل کر دیا۔ اسلام
مجھ سے تین گواہ مانگتا۔ کیا میرے پاس گواہ تھے یقیناً
نہیں اور اگر ہوتے بھی تب بھی اس کی سزا موت تو
نہیں تھی۔ ہم سب اپنا کیا بھگتتے رہے! اماں اور عائشہ
پر ہمارے گناہوں کا سایہ پڑا تھا۔ ہم سب ایک
دوسرے سے اندھا انتقام لے رہے تھے۔ اس لیے
ہماری زندگیوں میں کوئی سکون نہیں تھا۔ ہم کیوں
بھول جاتے ہیں کہ اللہ معاف کرنے کو زیادہ پسند فرماتا
ہے اور بہت بڑے اجر کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ تو پھر ہم
کیوں بھولی انا کے واسطے اتنے بڑے اجر کو بھول
جاتے ہیں۔ عملاً ”خدا کے وعدے پر یقین نہیں
کرتے۔ نتیجتاً بے اماں، بے سکون، بے چین
رہتے ہیں۔“

”میں بھی اب معاف کروں گا۔“ میں فیصلہ کر کے
پر سکون ہو گیا۔ اور پھر میں فجر کی نماز پڑھ کے گھر آ گیا۔
وہ بھی شاید ساری رات جاگی تھی۔ ابھی ابھی نماز
پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔

”سنو! بچوں کو اندر نہ آنے دے۔ میں سو رہا ہوں۔“
میں نے نارمل لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ وہ مطمئن ہو
کر باہر نکل گئی۔

پھر میں نے کبھی اسے یہ بات نہیں بتائی۔ کچھ ہی
دنوں بعد امید علی نے آکر ہماری کائنات مکمل کی۔
عائشہ نے کہا۔

”ہم بچے کا نام امید رکھیں گے۔ یہ ہم سب کی
امید ہو گا۔ ہم اسے صرف ایک اچھا اور نیک انسان
بنائیں گے۔“

”اس کے سارے اختیار میں تمہیں سونپ رہا

ہوں۔ جو تم چاہو گی۔ وہی ہو گا۔“
اب صرف اک غلش تھی کہ ملا کے لیے کچھ
کروں۔ پھر دس ایکڑ زمین کے کاغذات لال کے
ذریعے ماموں کو بھیجے تاکہ وہ اس بوجھ میں مزدوری
سے بچ جائے۔ اس کے دکھ کا کچھ تو ازالہ ہو اور یہ تجویز
بھی مجھے عائشہ نے ہی دی تھی۔ وہ اپنے ہر عمل سے
اپنے لیے میری محبت میں اضافہ کر رہی تھی۔



تین سالہ امید علی باہر جاتے ہوئے رضا کی جانب
دوڑا تھا۔ جب دیکھا کہ وہ پچھ نہیں سکے گا تو رونے لگا۔
رضا واپس مڑ کر ابھی دو قدم ہی چلا کہ علی نے آکر امید
کو اٹھایا اور رضا کے ساتھ باہر نکل گیا۔ وہ جو امید کو
اٹھانے لیے اٹھی تھی شوہر کے گھر کر۔ ”بیٹھ جاؤ۔“
کتنے پر اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”سنو! اک راز کی بات بتاؤں۔“ اس نے چہرہ آگے
کر کے رازدارانہ انداز میں کہا۔ اس کی شرارت سمجھتے
ہوئے عائشہ نے مسکرا کر زور سے ہاں میں سر ہلایا۔

”شوہر اگر ہو پوڑھا میرے جیسا۔“ انگلی سے اپنی
طرف اشارہ کیا ”تو یہی ہو جو ان تیرے جیسی۔“ پھر
اس کی طرف اشارہ کیا تو سمجھو میاں بکا زن مرید ہے۔
بیوی دن کو کچھ رات پوڑھا میاں کے آملو صدقہ۔“
جواباً ”تمہیں کی پٹاری کھل گئی۔ دونوں ہاتھوں
سے پیٹ کو پکڑے وہ لوٹ پوٹ ہو کر نفی میں سر ہلا
رہی تھی۔ میں نے مصنوعی غصے سے اس کے ہنستے
وجود کو گھور لیا۔

”کیوں میاں! بیوی کو لطیفے سنار ہے ہو کیا؟“ شیر علی
سامنے بڑے ہوئے جھولے میں بیٹھ کر بولا۔

”اوپر چاؤ میاں تو خود ہی لطیفہ بنا ہوا ہے۔“ میں
نے مسکین صورت بنا کر بے جا رنگ سے کہا۔ عائشہ کی رکتی
ہوئی ہنسی اک بار پھر شروع ہو گئی۔

”میرن! میں آج تمہارے آگے جھولی پھیلا کے

تیا ہوں۔“ شیر علی نے کہا۔
”ہاں میرن! ہمارے بچے اب جوان ہو گئے ہیں۔
رضا انیس کالور سارہ بندہ کی ہو چکی ہے۔ ہم چاہتے
ہیں کہ اب ان کی مکئی کروں۔“ بھر جانی کے منہ سے
یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔

”دیکھ میرن! انکار نہ کرنا۔“ گوا شیر نے التجا کی۔
”اوا! مجھ سے زیادہ عائشہ کا حق ہے ان پر۔ وہ جو بھی
فیصلہ کرے گی۔ مجھے قبول ہو گا۔“

”نہیں! آپ باپ ہیں، فیصلہ بھی آپ ہی کو کرنا
ہے۔“

”تمہاں ہو اور بچوں پر مکمل حق رکھتی ہو۔ پہلے ہی
میں سارے اختیار تمہیں سونپ چکا ہوں۔“ میں نے
اس کٹان بڑھایا۔

”ٹھیک ہے تو لوی رضا کو ڈاکٹر بننے دو، تب تک
سارہ بھی میڈیکل میں آجائے گی۔ پھر ہم ان کو مکئی کیا
شادی کروں گے فی الحال بچوں کی توجہ پڑھائی پر رہے تو
اچھا ہے۔“

”ٹھیک ہے عائشہ! روکھ سارہ میری بیٹی ہے۔
خیال رکھنا گوئی اس کا نام بھی نہ لے۔“

”ہاں اوی! ہم کب انکار کر رہے ہیں۔“

اور میں سوچ رہا ہوں۔ اسے کیسے میرے اندر کے
موسم کا پتہ چل جاتا ہے۔ میں بھی تو یہی چاہ رہا تھا۔
ٹھکانے والے خود میرے پاس آئے ہیں۔ یہ یقیناً
اس نیکی کا صلہ ہے۔ بے شک اللہ دونوں جہاں میں
بندے کو نیکی کا اجر دیتا ہے۔ ہاں بندہ ذرا دل بڑا کر لے
تو۔

ایک اور بات محبت صرف بڑوں ہی نہیں بتاتی۔
صحیح فیصلے بھی کرواتی ہے۔

